مختصر تذکرہ

بحر العلوم، خاتم مثنوی مولانا روم

حضرت
مفتی الٰہی بخش نشاط
کاندھلویؒ

تالیف

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی

مختصر تذکرہ

بحر العلوم، خاتم مثنوی مولانا روم

حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی

تالیف

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی

سلسلہ مطبوعات
حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ

نام کتاب ——— مختصر تذکرہ خاتم مثنوی مولانا روم
حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

تالیف ——— نور الحسن راشد کاندھلوی

صفحات ——— ۸۶

مطبع ———

سنہ طباعت ——— محرم الحرام ۱۴۲۲ھ اپریل ۲۰۰۱ء

قیمت ——— پچیس روپے ۲۵/۰۰

ناشر

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

مولویان کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی پن ۲۴۷۷۷۵

Ph: (01392) 22913

مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

فہرست مضامین

تمہید

یہ حقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں دین اور علم کا جو چرچا جاری ہے شریعت وسنت پر عمل کا ذوق ہے اور اصلاح وارشاد اور تعلیم وتربیت کی جو گرم بازاری ہے، وہ بڑی حد تک حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان والا شان اور خانوادۂ عالی مرتبت کی دینی علمی خدمات کا تصدق اور ان کے لگائے ہوئے چمن کی بہار ہے۔

خاندان ولی اللٰہی خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے جو اصحاب براہ راست وابستہ اور مستفید ہیں اور بعد میں خود آفتاب ومہتاب بن کر اُبھرے اور ہندوستان کے دینی علمی افق پر چمکے، ان میں غالباً سب سے نمایاں نام حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور یہ مفتی صاحبؒ کی توجہ محنت اور دینی علمی خدمات کا اثر ہے کہ بعد کے دور میں ضلع سہارنپور مظفرنگر کے چند قصبات اور بستیاں ایسے افراد کی جلوہ گاہ بنیں کہ جو ہندو پاکستان بلکہ پوری دنیا کے رہنما وامام ثابت ہوئے واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام علماء جنہوں نے بعد میں پورے برصغیر میں اسلامی زندگی کی جوت جگائی اور علم کی شمعیں جلائیں، وہ تقریباً سب ہی یا براہ راست مفتی صاحب سے مستفید ہیں یا مفتی صاحبؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں مگر تعجب بلکہ افسوس ہے کہ اب تک حضرت مفتی صاحب کی خدمات کے تعارف پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی اور مفتی صاحب کے علمی، دینی احسانات کا مناسب تعارف نہیں ہوا۔

زیر نظر تالیف اس سلسلہ کا پہلا قدم ہے جو مفتی صاحب کے مختصر تعارف اور خدمات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل ایک طویل مضمون ہے، جو سہ ماہی احوال وآثار کے پہلے دو شماروں میں چھپا تھا، اسی مضمون کو کسی قدر ترمیم اور جزوی اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے، امید ہے کہ اس سے ہماری دینی علمی تاریخ کے ایک گم شدہ ورق کی تجدید ہوگی اور ہماری دینی علمی عرفانی تاریخ میں حضرت مفتی الٰہی بخشؒ کے مقام وخدمات کا زیادہ بہتر عرفان ہو سکے گا۔
یہاں یہ بھی عرض کردینا چاہئے کہ زیر نظر صفحات مجمل تذکرہ ہیں، اس اجمال کی تفصیل مفتی صاحب کی مفصل سوانح میں آئے گی انشاءاللہ تعالیٰ!

نورالحسن راشد کاندھلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصبہ کاندھلہ مغربی یوپی کی ایک قدیم اور علمی دینی شہرت کی بستی ہے، اس بستی کی آبادی کا سبب، وجہ تسمیہ اور ابتدائی حالات معلوم نہیں، مقامی روایات میں اس کے نام اور اس کی ابتدائی آبادی کا رشتہ ما قبل تاریخ کے عہد اور جنگ مہابھارت سے وابستہ کیا جاتا ہے، مگر اس روایت کی تصدیق آسان نہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ خاصی پرانی آبادی ہے، جو ممکن ہے کہ ایک ہزار سال سے متجاوز ہو۔ اگرچہ اس نواح میں مسلمانوں کی اول اول آمد اور قیام کا حال محقق نہیں لیکن بعض قرائن اور دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نواح (خصوصاً تھانہ بھون) میں چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے مسلمان موجود اور آباد تھے، چھٹی صدی ہجری کے بعد یہاں مسلمانوں کی آبادی میں خاصا اضافہ ہوا، اسی دور میں یہ پورا خطہ سلطنت دہلی کے زیر نگیں آگیا تھا، اور کاندھلہ نیز اطراف کے قصبات میں دربارِ دہلی سے دینی امور کی نگرانی کے لئے علماء اور قاضی مقرر کیے گئے تھے۔

کاندھلہ کی ایسی قدیم ترین شخصیت (جن کا راقم سطور کو علم ہے) قاضی محمد عبد اللہؒ کی تھی۔ قاضی محمد عبد اللہ غالباً قطب الدین ایبک کے عہد میں اس نواح خصوصاً کاندھلہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے، ان کے نام التمش کا فرمان جو ۵ر صفر ۶۰۷ھ (۲۹ر جولائی ۱۲۱۰) کا لکھا ہوا تھا ۱۹۴۷ء تک موجود تھا میں نے یہ فرمان یا اس کی نقل نہیں دیکھی مگر کاندھلہ کے شیوخ کے جائداد کے ایک مقدمہ میں اس کا تفصیلی حوالہ موجود ہے اور اس حوالہ کی استنادی حیثیت پر کسی فریق کی جانب سے بھی اعتراض نہیں کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرمان بالکل صحیح اور اہل کاندھلہ کی نظر میں مستند اور معتبر تھا۔

قاضی محمد عبد اللہ کے عہد میں اور اس کے بعد کاندھلہ کی آبادی کیا تھی اور یہاں مسلمانوں کی کیا حیثیت تھی اور اس کے بعد تقریباً دو سو سال تک اس بستی میں دینی معاملات کی نگرانی قضابت واحتساب کے فرائض کی ذمہ داری اور مسلمانوں کی دیگر خدمات کی بجا آوری کی کیا

ترتیب رہی معلوم نہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانہ میں بھی کاندھلہ میں قاضیوں کا تسلسل رہا اور مسلمانوں کی غالباً خاصی آبادی تھی۔

قاضی ضیاء الدین سنامی کے پرپوتے کا کاندھلہ میں قاضی کے عہدہ پر تقرر اور ان کی اولاد کا یہاں قیام

آٹھویں صدی ہجری کی آخری دہائی (تقریباً ۱۳۸۸ عیسوی) میں ہندوستان کے ممتاز عالم قاضی ضیاء الدین سنامی کے پرپوتے قاضی کریم الدین مذکر قصبہ کاندھلہ میں مراسمِ دین کی نگہبانی اور امامت کی خدمت پر دہلی کی حکومت کی جانب سے مامور تھے لیکن رجب ۷۹۳ھ (آخر جون ۱۳۹۰ء) سے غالباً کئی مہینے پہلے ان کی وفات ہوگئی تھی، رجب ۷۹۳ھ تک قاضی کریم الدین کے فرزند مولانا قاضی شیخ محمد دربار دہلی کی منظوری اور اطلاع کے بغیر اپنے والد کی جگہ پر متعلقہ خدمت انجام دے رہے تھے، رجب ۷۹۳ھ میں جب اس وقت کا بادشاہ سلطان (ابو الفتح محمد شاہ بن فیروز شاہ) تغلق (۱) کاندھلہ پہنچا تو مولانا شیخ محمد نے بادشاہ کے سامنے یہ سب واقعہ اور تفصیل پیش کی، محمد تغلق نے مولانا محمد کو قاضی کریم الدین کی مقررہ خدمات اور منصب کی بجا آوری کا اہل پایا اور مولانا محمد کو اس قصبہ کی دینی خدمات کے لئے مقرر کر دیا۔ قاضی شیخ محمد (خلف قاضی کریم الدین) مذکر پوری زندگی اس خدمت پر مامور اور قصبہ کاندھلہ میں مقیم رہے، یہیں وفات ہوئی، اس کے بعد سے آج تک کاندھلہ قاضی ضیاء الدین کی اولاد کی ایک شاخ کا وطن ہے۔

قاضی محمد مذکر کی اولاد ماشاء اللہ خوب پھلی پھولی اور اس خاندان کی بہت سی شاخوں کا کئی سو برس تک کاندھلہ سے وطن ہونے کا تعلق قائم اور باقی رہا، اور اب بھی اس سلسلے کی کئی شاخیں اس بستی کی خاک کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک مشہور و معروف اور پر بہار شاخ وہ ہے جو مولانا محمد اشرف جھنجھانوی کی اولاد میں ہے اور اسی کے ذریعہ سے حضرت مفتی الٰہی

(۱) عموماً تاریخوں میں محمد بن فیروز شاہ تغلق کے نام کے ساتھ ابو الفتح کا خطاب درج نہیں مگر محمد شاہ تغلق کے اصل فرمان پر موجود ہے، ظاہر ہے کہ تاریخوں کی بہ نسبت یہ حوالہ زیادہ معتبر ہے۔

بخشؒ، ان کے آباء و اجداد اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ وغیرہ جڑے ہوئے ہیں۔

مگر اس خاندان کا جو نسب نامہ مشہور ہے اور کئی کتابوں میں چھپا ہوا بھی ہے اس میں مولانا محمد اشرف کی اولاد کا نسب شیخ قطب شاہ سے دکھایا گیا ہے مگر یہ روایت اطلاع اور تحریریں صحیح نہیں ہیں، مجھے بے حد تلاش و جستجو کے باوجود کسی معتبر و مستند ذریعہ سے سلسلہ اجدادِ مفتی الٰہی بخش کی شیخ قطب شاہ سے وابستگی کی تصدیق نہیں ہوئی بلکہ قطب شاہ (۲) کون تھے یہ بھی معلوم نہیں، اگر قطب شاہ نام کے کوئی شخص تھے تو کہاں اور کب تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ ان کا زمانہ، حالات سلسلہ نسب اور مفتی الٰہی بخش کے بزرگوں کا قطب شاہ کی اولاد میں کچھ ثبوت نہیں ملا۔

قطب شاہ کی نامعلوم شخصیت اور خانوادہ مفتی الٰہی بخشؒ کا شیخ قطب شاہؒ سے انتساب

حقیقت یہ ہے جو مولانا محمد اشرف کے حقیقی دادا، شیخ نور محمد عرف بابن شاہ اور ان کی اولاد کے زمانہ کی لکھی ہوئی تحریروں سے بالکل صاف ہوکر سامنے آئی ہے کہ مولانا محمد اشرف بابن شاہ اور کاندھلہ کا صدیقی خاندان نیز قاضی کریم الدین مذکر کی اولاد کی ہی سلسلہ کی شاخیں ہیں اور ایک ہی خاندان سے وابستہ و منسلک ہیں۔

(۲) اگرچہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ:

"ان (قطب شاہ) کے نام تغلق کا فرمان ۷۸۳ھ کا لکھا ہوا حاجی محسن کے پاس موجود ہے۔" بیاضِ کبیر ص ۲۳

مگر اس اندراج کی دونوں باتیں تحقیق طلب ہیں۔ اول تو اس کا عہد تحریر، اگر یہ فرمان ۷۸۳ھ کا لکھا ہوا ہے تو اس کو محمد شاہ بن فرید خاں کا ہونا چاہئے۔ اور اگر اس میں تغلق کا حوالہ صحیح ہے تو اس کا عہد کتابت آٹھویں صدی ہجری (قبل از ۸۰۰ھ) کا زمانہ ہوگا اس اشتباہ کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ حقیقت کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حاجی محمد محسن کے مرتب کئے ہوئے خاندانی شجرہ میں (جو سب سے زیادہ معتبر و مفصل شجرہ ہے جس میں ہر اندراج کے لئے مستند دستاویزات کے مسلسل حوالے درج ہیں) شیخ قطب شاہ کے نام کے کسی بھی فرمان کا کوئی حوالہ درج نہیں ہے۔ نیز حاجی محمد محسن مرحوم (وفات: ۱۳۷۳ھ۔ ۱۹۵۳ء) کے جمع کئے ہوئے ہزارہا کاغذات میں بھی اس اس فرمان کی یادداشت یا تاریخ و نشان نہیں ملا۔ اس لئے جب تک اصل فرمان یا اس کی معتبر نقل دستیاب نہ ہو اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہنا صحیح نہیں۔"

مولانا محمد اشرفؒ کی اولاد اور بزرگوں قاضی محمد خلف قاضی کریم الدین مذکر کاندھلوی کی اولاد اور خاندان سے الگ کیئے جانے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، بلکہ یہ روایت واطلاع غلط فہمی اور ناواقفیت پر مبنی ہے ایسا خیال ہے کہ کسی شخص نے حقائق سے واقفیت کے بغیر شجرہ کی نقل کا ارادہ کیا اور ایک جیسے دوناموں کو صحیح نہ پہچاننے کی وجہ نسب کو قطب شاہ سے جوڑ دیا، اور اس کی یہ غلطی بعد والوں کے لئے ایک مستقل موضوع گفتگو بن گئی اور اس غلطی کی وجہ سے اس خاندان کا صحیح نسب نامہ، قدیم دستاویزات و فرائض کے مندرجات نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

اور اس غلطی کی وجہ سے خود مرتب شجرہ یا کسی اور شخص نے (جو غالباً اصل شجرہ اور دستاویزات سے قطعاً ناواقف تھے) قاضی شیخ محمد کے نام کے بعد شیخ قطب شاہ کا اضافہ کردیا، اس غلط فہمی کی وجہ سے یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوگیا کہ مفتی الٰہی بخشؒ اور اس پورے خاندان کا ماضی اور تاریخ کیا ہے اور اس کا صدیقی ہونا کس طرح صحیح ہے؟

خاندان کے امام فخر الدین رازیؒ کی اولاد میں ہونے کی روایت بھی درست نہیں۔

اس خاندان کے نسب کے متعلق ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ اس خاندان کا سلسلہ نسب شہرۂ آفاق عالم ومفسر، امام فخر الدین رازی، مؤلف تفسیر کبیر (وفات ۶۰۶ھ) سے مل جاتا ہے۔ یہ روایت تذکرہ مفتی الٰہی بخشؒ مؤلفہ مولانا محمد سلیمانؒ اور نزہۃ الخواطر میں بھی درج ہے جس کی وجہ سے مولانا احتشام الحسنؒ کاندھلوی اور دوسرے اہل قلم نے بھی اس کو نقل کردیا ہے مگر یہ روایت بھی بے بنیاد اور ناقابل اعتماد ہے۔ مفتی الٰہی بخش اور مولانا محمد الیاسؒ کے سلسلہ نسب کی جو نئی پرانی نقلیں اور معتبر دستاویزات موجود ہیں ان میں فخر الدین محمد نامی کسی شخص کا ذکر نہیں اور یہاں یہ بھی واضح کردینا چاہئے کہ خود امام رازیؒ کا صدیقی ہونا بھی مشتبہ ہے اور امام فخر الدینؒ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: محمد بن عمر بن الحسن بن الحسین
جب کہ یہ نام اس ترتیب سے اس خاندان کے کسی بھی شجرہ میں درج نہیں، لہٰذا یہ

اطلاعات بھی غلط اور ناقابل ذکر ہیں۔

خیال یہ ہے کہ مفتی الٰہی بخشؒ کے قطب شاہؒ کی اولاد میں ہونے کی معروف روایت کی عمر سو سوا سو سال سے زائد نہیں، اگر قطب شاہؒ کی موجودگی کی کچھ حقیقت ہوتی تو مفتی صاحب کی بیاضوں، تحریروں اور اس خاندان کے دوسرے بزرگوں کی یادداشتوں اور کاغذات میں اس کا تذکرہ آنا چاہئے تھا، لیکن مجھے ایک تحریر بھی ایسی نہیں ملی جس میں اس کا ذکر ہو۔

خاندان مولانا محمد اشرف کے قاضی ضیاء الدین سنامیؒ کی اولاد میں ہونے کے ثبوت

لیکن اس کے بالکل برعکس بابن شاہ اور خانوادہ مفتی الٰہی بخشؒ کے مولانا قاضی شیخ محمدؒ خلف قاضی کریم الدینؒ کی اولاد میں ہونے کی متعدد دستاویزات سے تائید ہو رہی ہے۔

(۱) اکبر، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد کے فرامین جن کی پشت پر خانوادۂ قاضی محمد کے ورثاء کے نام درج ہیں، جس میں شیخ نور محمد عرف بابن شاہؒ اور ان کے حقیقی بھائیوں کا کئی موقعوں پر صاف صاف اندراج ہے۔

(۲) بابن شاہ کے فرزند، مولانا شیخ جمال محمد نیز مولانا شیخ کمال محمد اور شیخ منصور کے نام فرامین بیعناموں اور فرائض (ترکہ) کے کاغذات میں ان سب کے بابن شاہ کی اولاد ہونے کی صراحت ہے۔

(۳) قاضی غلام حسین متوفی ۱۲۵۸ھ (معاصر مفتی الٰہی بخشؒ) کا رجسٹر جس کے متعدد اندراجات میں بابن شاہ اور مولانا شیخ جمال محمد کو بادشاہوں کی طرف سے عطا اراضی پر مفتی صاحب کا نام بحیثیت وارث و قابض لکھا ہے۔

(۴) مولانا ابوالحسن و مولانا نور الحسن کاندھلوی (اخلاف حضرت مفتی الٰہی بخشؒ) کی ۱۸۳۶ء کے بندوبست کے موقع پر کمشنر بندوبست کو پیش کی گئی تحریریں اور فرمان جس میں مولانا نے خود کو جمال محمد شاہ وغیرہ کا جائز وارث اور ان کی جائیداد کا مالک و قابض دکھایا ہے اور کمشنر کی تحقیقات نے اس کی تصدیق کی ہے، جو ان دستاویزات کے بعض اندراجات سے ظاہر ہے۔

⑤ سرسید احمدؒ کی ایک تحریر، جس میں حضرت مفتی الٰہی بخشؒ نیز مولانا نور الحسن کاندھلویؒ اور ان کی اولاد کو قاضی ضیاء الدین سنامی کی اولاد اور ان کی جائیداد کا صحیح قابض بتایا ہے، جو قاضی شیخ محمد تغلق کے فرمان محررہ ۷۹۳ھ کے ذریعہ ملی تھیں۔ سرسید احمد کی اس تحریر کی بوجوہ خاص اہمیت ہے، سرسید احمد نہایت مبصر و باخبر، اطراف دہلی کے افراد اور خاندانوں سے وسیع واقفیت رکھنے والے شخص تھے، اس کے علاوہ سرسید احمد کی تاریخ پر بھی گہری نظر تھی، وہ اہم ترین تاریخی کتابوں کی تصحیح واشاعت کی خدمت انجام دے چکے تھے۔ مزید یہ کہ سرسید احمد کے خانوادۂ مفتی الٰہی بخش سے قدیم خاندانی تعلقات تھے، خود سرسید احمد نے لکھا ہے:

"اس خاندان سے اور میرے خاندان سے کئی نسلوں سے بہت زیادہ تعارف رہا ہے۔"

اور خانوادۂ مفتی الٰہی بخشؒ کے اُس وقت موجود اکابر کی نگاہ میں بھی سرسید احمد کی خاص وقعت تھی، سرسید نے مولانا نور الحسنؒ سے طویل استفادہ کیا تھا اور تعلیم پائی تھی اسی وجہ سے سرسید ہمیشہ اس گھرانے سے اپنے گھر اور قریب ترین عزیزوں کا سا معاملہ رکھا، اس پس منظر میں سرسید احمد اگر یہ لکھیں کہ:

"یہ خاندان حضرت ابو بکر صدیقؓ خلیفۂ اوّل رسولِ اکرم ﷺ کی نسل میں ہے۔ اب سے پانچ سو برس گذرے بعہد سلطنت فیروز شاہ تغلق یہ خاندان ہندوستان کے اس حصہ میں آکر آباد ہوا۔ یہ خاندان اب تک ان اراضیات پر قابض ہے جو اس کو بہ موجب اصلی فرمان رجب ۷۹۳ھ عطا کردہ محمد شاہ تغلق (جس کا زمانہ سلطنت بہت قلیل رہا ہے) عطا کیے گئے ہیں۔" (۳)

تو اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔

(۳) یہ الفاظ اس سند یا سرٹیفکیٹ میں درج ہیں جو مولوی علاء الحسن (از اخلاف مفتی الٰہی بخش) کاندھلوی کو ۱۸۹۳ء میں ایم اے او کالج علی گڈھ سے عطا کی گئی تھی۔ یہ تحریر بتمام وکمال جسٹس سید محمود کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، جو سرسید احمد کی ہدایت پر لکھی گئی ہے اور خود سرسید احمد کے قلم سے اس میں ترمیم وتصحیح ہے۔ یہ سند ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ بعض معلومات کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: حیات سرسید کا ایک گمشدہ ورق۔ ماہنامہ آجکل، دہلی (اپریل ۱۹۷۵ء)

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں مجھے یہ کہنے میں کچھ بھی تامل نہیں کہ صحیح سلسلہ وہی ہے جو قاضی کریم الدین مذکر کے واسطے سے ہے اور قاضی ضیاء الدین سنامی تک ہوتا ہوا حضرت ابو بکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا گزشتہ تقریباً پچاس سال میں جن کتابوں اور تحریرات میں مفتی صاحب کا سلسلہ نسب شیخ محمد فاضل و شیخ قطب کے واسطے سے نقل کیا گیا ہے وہ یکسر غلط، موجودہ ماخذ و شواہد کی روشنی میں ناقابل تسلیم اور فرضی ہے، اس کی صداقت اور استناد پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا قاضی محمد مذکر کے عہد سے مفتی الٰہی بخش تک ہر دور کی، ہر عہد کی درجہ بہ درجہ دستاویزات کی آج تک موجودگی نسب نامہ خاندان مفتی الٰہی بخش کے قطب شاہ سے انتساب کی تردید کے لئے کافی ہے۔ تفصیلات کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے، یہاں اس کا موقع نہیں (۴)

قاضی ضیاء الدین سے سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ تک

قاضی ضیاء الدین کا نام نامی محمد، ان کے والد ماجد کا عمر، دادا کا عوض ہے۔ قاضی صاحب کے جد عوض سے حضرت ابو بکر صدیقؓ تک سلسلۂ نسب تذکرہ نگاروں نے نقل نہیں کیا، لیکن قاضی صاحب کے متعدد صاحبزادے تھے، ان کی اولادیں برصغیر کے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سب کا صدیقی ہونا تقریباً متواتر و متعارف ہے۔ نسب نامہ خاندان قاضی ضیاء الدین سنامی کا یہ نہایت اہم پہلو مولانا محمد علی صدیقی (۵) کاندھلوی کی کوشش سے دریافت

(۴) بعض مختصر معلومات کے لئے رجوع فرمائے راقم سطور کا مضمون "شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی: اجداد، صحیح نسب نامہ اور حالات" "شیخ الحدیث نمبر، جلد اول "الفرقان" لکھنؤ ص ۳۹ تا ص ۵۱۔

(۵) مولانا محمد علی صدیقی خلف مولانا صدیق احمد کاندھلوی (وفات ۱۴۱۳ھ۔ ۱۹۹۲ء) مؤلف تفسیر معالم القرآن و امام اعظم اور علم الحدیث وغیرہ پانچ سال سے قاضی ضیاء الدین سنامی اور ان کی کتاب نصاب الاحتساب پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس میں قاضی ضیاء الدین کے سلسلۂ نسب کی تحقیق بھی خاص موضوع تھا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ نصاب الاحتساب کے تفصیلی مقدمہ میں اپنے نتائج تحقیق درج کریں گے۔ مولانا نے اس کتاب کی تیاری کے لئے پاکستان کے علاوہ ممالک اسلامیہ کے بعض اہم کتب خانوں سے بطور خاص استفادہ کیا تھا، مگر ابھی یہ کام پورا نہیں ہوا تھا کہ مولانا مختصر علالت کے بعد ۲۰ رجمادی الاخر ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اچانک رحلت کر گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ قاضی ضیاء الدین سنامی پر مولانا کے اس وقیع اہم کام کا جناب ابن نجار صاحب نے اپنی تحریر مطبوعہ ہفت روزہ "حرمت" اسلام آباد، اشاعت ۱۶ تا ۲۲ دسمبر ۱۹۹۳ء میں بھی ذکر کیا ہے۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

ہوا۔ مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ قاضی ضیاء الدین کا سلسلۂ نسب دو واسطوں سے صدیقیانِ سہرورد کے اس مبارک سلسلہ سے مل جاتا ہے جو شیخ ابو النجیب سہروردیؒ اور ان کے نامور برگزیدہ بھتیجے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہے۔(٦)

مولانا محمد علی کاندھلوی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قاضی ضیاء الدین سنامیؒ کے دادا عوض، شیخ شہاب الدین سہروردی کے حقیقی بھائی تھے اور جعفر بن محمد کے فرزند تھے۔ اگر مولانا محمد علی کی یہ تحقیق صحیح ہے تو مفتی الٰہی بخش کا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک مکمل نسب نامہ اس طرح ہے:

> "مولانا مفتی الٰہی بخش، خلف مولانا محمد عرف شیخ الاسلام، بن حکیم قطب الدین، بن حکیم عبد القادر، بن مولانا محمد شریف، بن مولانا محمد اشرف، بن مولانا جمال محمد، بن مولانا نور محمد عرف بابن شاہ، بن مولانا قاضی بہاء الدین، بن مولانا شیخ محمد، بن قاضی کریم الدین مذکر، بن امام تاج الدین مذکر، بن امام حاج، بن قاضی ضیاء الدین محمد (٧)، بن عمر، بن عوض۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مولانا کبھی کبھی راقم سطور کو اپنی تحقیقات سے مطلع فرماتے رہتے تھے۔ خاندان کے نسب نامہ پر میرا جو مضمون ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نمبر جلد اول میں چھپا تھا مولانا نے اس کو کوئی مرتبہ پڑھا۔ اس کی تحسین و تصویب فرمائی اور میری اس رائے کی تائید فرمائی جو نسب نامہ کی معروف روایت کے غلط ہونے اور صحیح ترتیب کی جستجو پر مشتمل تھا اور لکھا کہ "تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے دل کی بات ہے میری بھی یہی رائے ہے" مجھے اس تائید سے بے حد مسرت ہوئی کیونکہ مولانا واحد شخص تھے جنہوں نے خاندانی نسب نامہ کو علمی تاریخی حیثیت سے جانچا پرکھا تھا۔

(٦) مولانا نے راقم سطور کے نام سے خطوط میں اپنی اس تحقیق کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس میں یہ تحریر نہیں کہ مولانا کی اس تحقیق کا ماخذ کیا ہے۔ خیال تھا کہ قاضی ضیاء الدین اور ان کے خاندان و نسب کے متعلق جب مولانا کی تحقیقات سے مزین ہو کر نصاب الاحتساب شائع ہوگی، اس میں یہ سب مباحث مفصل آئیں گے اور ان کے سب حوالے بھی درج ہوں گے، اس لئے مولانا سے یہ معلوم کرنے کا خیال نہیں ہوا کہ یہ اطلاع مولانا نے کہاں سے لی ہے۔ تاہم امید یہ ہے کہ اس کے لئے معقول علمی تاریخی شواہد موجود ہوں گے لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس پہلو پر مزید تحقیق و توجہ کی ضرورت ہے۔

(٧) قاضی ضیاء الدین سنامی تک نسب نامہ تمام قدیم دستاویزات، نسب ناموں خصوصاً اس نسب نامہ میں درج ہیں جو قاضی غلام حسین کاندھلوی (وفات: ۱۲۵۸ھ) کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس پر قاضی صاحب کے دفتر قضات کی مہر بھی ثبت ہے...... قاضی ضیاء الدین نے اپنا، اپنے والد ماجد اور دادا کا نام اپنی مشہور کتاب نصاب الاحتساب کی تمہید میں لکھا ہے۔

بن ابو جعفر محمد، بن عبداللہ، بن محمد، بن عبد اللہ عمویہ، بن سعد، بن حسین، بن قاسم، بن نضر (۸) بن قاسم، بن عبداللہ، بن عبد الرحمٰن، بن قاسم، بن محمد، بن سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ" (۹)

ابو جعفر محمد واعظ بغدادی: ابو جعفر محمد بن عبداللہ بن محمد بغداد کے مشہور واعظ اور فقیہ تھے، بغداد میں اسعد یمنی سے فقہ پڑھی اور وعظ سیکھا، بعد میں قاضی بغداد مقرر ہوگئے تھے، یوسف دمشقی کہتے ہیں کہ میں نے جامع قصر اور نظامیہ میں ابو جعفر محمد کا وعظ سنا ہے۔ ابو جعفر محمد کے مشہور فرزند شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (ولادت رجب ۵۳۹ھ) چھ مہینے کے تھے، اس وقت ابو جعفر محمد قتل کر دیئے گئے تھے۔

اس خاندان کی ہندوستان میں آمد

ممکن ہے یہی واقعہ عوض (بن ابو جعفر محمد) کے ترکِ وطن کا سبب ہوا ہو یا اس مہاجرت ومسافرت کا کوئی اور سبب تھا جو ہمیں معلوم نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ عوض ابن محمد بن جعفر نے بغداد سے کب رخت سفر باندھا اور کب ہندوستان وارد ہوئے۔ مختصر طور پر صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ہندوستان آکر شاہی ملازمت سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے بلند ترین عہدوں پر پہنچے (۱۰)

محمد بن عوض: محمد بن عوض پائے کے عالم تھے، ضیاء برنی نے قاضی ضیاء الدین کے تذکرہ

(۸) قاسم بن نضر پر شیخ شہاب الدین سہروردی اور محدث ابن جوزی کا سلسلہ نسب ایک ہو جاتا ہے۔ سیر اعلام النبلاء ص ۳۶۷، ج ۲۲ (بیروت ۱۴۰۵ھ)

ایک روایت کے مطابق حسین بن القاسم بن نضر سے امام فخر الدین رازی کا سلسلہ نسب بھی متصل ہے۔ گویا یہ سب ایک ہی شجر کی شاخیں ہیں۔

(۹) ابو جعفر محمد سے حضرت ابو بکر صدیق تک پیش نظر ترتیب علامہ ذہبی کی تصریح کے مطابق ہے۔ ملاحظہ ہو: سیر اعلام النبلاء، ص ۳۷۴، ج ۲۲۔ اور یہی نسب نامہ اسی ترتیب کے مطابق ابن النجار نے ذیل تاریخ بغداد میں بھی نقل کیا ہے۔ ابن النجار نے لکھا ہے کہ میں یہ نسب نامہ شیخ ابو النجیب سہروردی کی تحریر سے نقل کر رہا ہوں۔ ان ائمہ اعلام کی تحقیق وتصدیق کے بعد اس کے صحیح ہونے میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے۔

(۱۰) سیر اعلام النبلاء ص ۳۷۶، ج ۲۲۔ (بیروت: ۱۴۰۵ھ)

میں محمد بن عوض کو استاذ عہد شمار کیا ہے (۱۱) معزالدین بہرام شاہ کے عہد حکومت (۶۳۷ھ تا ۶۳۹ھ مطابق ۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۲ء) میں پورے ملک کے آڈیٹر جنزل (-Auditor Genral) مستوفی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے اور ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب پورے ملک کا انتظام اور تمام تر اختیارات و وسائل اختیار الدین (نائب سلطان) نظام الدین (مہذب الدین) اور محمد بن عوض مستوفی نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور بادشاہ کو گویا معطل کر دیا تھا۔ یہ بات بادشاہ کی ناخوشی کا سبب ہوئی اور اس نے نائب سلطان کو سر دربار قتل کروادیا تھا (۱۲) ممکن ہے اس وقت محمد بن عوض پر بھی عتاب نازل ہوا ہو، غالباً یہی وجہ ہے کہ منہاج سراج نے نظام الملک کے قتل کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد اپنی پوری کتاب (طبقات ناصری) میں محمد بن عوض کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔

ایک غلط فہمی کی وضاحت: آقائے حبیبی نے غالباً سہواً نظام الملک مہذب الدین اور محمد بن عوض مستوفی کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے یہ دونوں ایک ہی شخص کے دو نام ہیں (۱۳) یہی غلطی نزہۃ الخواطر میں بھی جگہ پا گئی ہے (۱۴) مولانا حسنی نے بھی محمد بن عوض مستوفی اور نظام الدین مہذب الدین کا ایک ہی عنوان کے تحت ذکر کیا ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ نظام الملک نائب سلطان تھے اور محمد بن عوض مستوفی۔

قاضی ضیاء الدین سنامیؒ

محمد بن عوض کی اولاد کی تفصیل ہم دست نہیں مگر ان کے ایک صاحبزادے کا تذکرہ علماء ہند کی تاریخ کا غازہ ہے۔ یہ فرزند والا شان اپنی دینی اصابت و صلابت اور اتباعِ سنت میں نادرۂ روزگار، احکامِ شریعت کی حرف بحرف پاسداری میں فخر اقران و امثال اور شریعت کی

(۱۱) تاریخ فیروز شاہی، ضیاء برنی۔ ترجمہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ص ۵۱۷ (لاہور: ۱۹۸۳ء)
(۱۲) طبقات ناصری، منہاج سراج، اردو ترجمہ غلام رسول مہر، ص ۸۱۹، جلد اول (لاہور: ۱۹۷۵ء)
(۱۳) طبقات ناصری اردو ترجمہ، ص ۸۲۸۔
(۱۴) نزہۃ الخواطر، ص ۱۶۸، جلد اول (طبع دوم، حیدر آباد: ۱۳۸۲ھ)

معمولی خلاف ورزی اور طریقۂ سنت سے سرمو انحراف کی صورت میں بڑے بڑوں کو سر مجلس بلاتامل تبلیغ و نصیحت کرنے میں نہ صرف اپنے زمانہ میں بلکہ تاریخ اسلام کی نادر شخصیات میں سے ایک ہیں۔

ان کا نام نامی محمد اور لقب ضیاء الدین ہے، جن کی زندگی کا اگرچہ اکثر حصہ دہلی میں گذرا مگر سنامی نسبت سے مشہور ہیں۔

قاضی ضیاء الدین سنام (۱۵) میں تولد ہوئے، ابتدائی زندگی وہیں گذری، مولانا کمال الدین سنامی سے تعلیم حاصل کی اور طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔

تعلیم اور علمی سفر کی تفصیلات دریافت نہیں، صرف یہ معلوم ہے کہ بعد میں دہلی آگئے تھے، یہاں دینی خدمات میں زندگی بسر فرمائی، فقہ، تفسیر، حدیث اور وعظ میں اپنے وقت کے امام تھے (۱۶) اتباعِ سنت تقویٰ اور دعوتِ حق میں فخر اقران رہے۔ شریعت کی قدم بہ قدم پابندی واشاعت اور غیر مسنون باتوں کی مخالفت میں بڑے بڑوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے،

---

(۱۵) سنام، مشرقی پنجاب ہند میں پٹیالہ سے ۴۳ میل جنوب مغرب میں دریائے راوی و ستلج کے دوآبہ میں واقع ہے۔
اس قصبہ کے بانی اور ابتدائی تاریخ کی صحیح تحقیق نہیں مگر اس کا ہندوستان کی قدیم بستیوں میں شمار ہے۔ کم سے کم ماقبل مسیح کی آبادی ہے۔ یہاں مسلمان بھی بہت قدیم سے آباد ہیں۔ میاں اخلاق احمد صاحب نے IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA ص ۲۸۶، جلد ۲ (۱۹۰۸ء) کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ "ہندوستان میں سب سے پرانی مسجد کے نشانات سنام میں پائے جاتے ہیں۔" (میر کارواں، ص ۶۰ و ص ۹۰)۔ یہ شہر غزنویوں کے دور میں شاداب و پر بہار تھا۔ البیرونی یہاں آیا ہے اور اس نے کتاب الہند میں سنام کا تذکرہ کیا ہے۔ سنام میں آباد جن علماء و اہل کمال کے حالات عموماً دستیاب ہیں، ان میں قدیم ترین منتخب شخصیت حضرت محمود ہنوئی بخاری (وفات ۵۱۵ھ۔۱۱۲۱ء) کی ہے۔ اس وقت سے عہد مغلیہ تک یہ بستی علماء اور ارباب باطن کا مرجع و مسکن رہی ہے۔ یہاں ہر دور میں برگزیدہ اہل معرفت فخر روزگار علماء اور صف اول کے ادیب و شاعر پیدا ہوتے رہے۔
اس بستی کی تاریخ کا عنوان بھی ناقابل فراموش ہے کہ برصغیر کے اس ممتاز فاروقی خانوادہ کے اجداد و شیوخ نے جس سے حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت مجدد الف ثانی جیسے کاملین وابستہ ہیں برصغیر میں آمد کے وقت سب سے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا۔ یہیں سے وہ دوسرے مقامات پر گئے اور یہیں سے اس کی خوشبو برصغیر کے کونے کونے میں پہنچی۔
سنام کی تاریخ اور چند مشاہیر کے متعلق معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "میر کارواں" (احوال سید محمود ہنوئی سنامی) تالیف میاں اخلاق احمد (لاہور: ۱۹۸۲ء)

(۱۶) اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۲۴۔۱۲۳ (احمدی دہلی: ۱۲۷۰ھ) نزہۃ الخواطر، ص ۹۳، ج ۲ (حیدرآباد: ۱۴۰۷ھ)

یہاں تک حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور بو علی شاہ قلندرؒ جیسے اکابرین کو بھی برملا تبلیغ وتنبیہ فرماتے تھے، یہ حضرات بھی قاضی صاحب کے اخلاص اور اتباع شریعت و سنت کے بے حد مداح و معترف تھے اور قاضی صاحب کے احکام وہدایات کی تعمیل فرماتے رہتے تھے۔ قاضی صاحب کا تذکرہ فرماتے ہوئے شیخ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

"معاصر شیخ نظام الدین اولیاء بود، دائم شیخ از جہت سماع احتساب کرد و شیخ ہاوے جز بمعذرت وانقیاد پیش نیامدے، ودر تعظیم مولانا دقیقہ نامرعے نگذاشتے۔" (۱۷)

ترجمہ: حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے زمانہ میں تھے اور ہمیشہ شیخ کا (سماع کے ذوق کی وجہ سے) محاسبہ کرتے رہتے تھے اور شیخ (نظام الدین) معذرت اور سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہ فرماتے تھے اور قاضی صاحب کی تعظیم میں کسی پہلو سے بھی کوتاہی نہ فرماتے تھے۔

قاضی صاحب کا وعظ معلومات، حسن بیان، قوت تاثیر اور حاضرین کی کثرت کی وجہ سے مشہور و ممتاز ترین حلقۂ وعظ تھا۔ ضیاء الدین برنی نے قاضی صاحب کی مجلس وعظ، تبحر علمی اور بڑی تعداد میں سامعین کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے (۱۸) مگر چوں کہ برنی حضرت نظام الدین اولیاء کا وابستۂ دامن ہے اور قاضی صاحب نے حضرت کے ذوقِ سماع پر کئی مرتبہ نکیر کی تھی اس لئے برنی قاضی صاحب سے ناخوش ہے، مگر ناخوشی کے باوجود کمال کا اعتراف برنی کے وسعت ظرف اور قاضی صاحب کے مرتبہ و کمال کی بڑی سند ہے۔

قاضی صاحب کی متعدد اعلیٰ درجہ کی تصنیفات یادگار ہیں، جس میں نصاب الاحتساب اپنی فنی اہمیت اور خصوصیات کی بناء پر نہایت مشہور و ممتاز ہے۔ قاضی صاحب کی دیگر تصنیفات میں تفسیر سورہ یوسف، فتاویٰ ضیائیہ (مجموعہ فتاویٰ) رسالہ نکاح اور شرح منظومہ عثمانی اور ایک رسالہ جس کے نام کی تحقیق نہیں، معلوم ہیں۔

(۱۷) اخبار الاخیار، ص ۲۴۔ ۱۲۳، احمدی (دہلی: ۱۲۷۰ھ)

(۱۸) تاریخ فیروز شاہی، ضیاء برنی، اردو ترجمہ، ص ۵۱۷۔ ۵۱۸ (لاہور: ۱۹۸۳ء)

قاضی صاحب کا صحیح سنہ وفات معلوم نہیں، مقام وفات اور مدفن کے متعلق بھی دو روایتیں ہیں، مشہور روایت وہ ہے جو عموماً نقل کی جاتی ہے اور شیخ عبدالحق نے بھی اخبار الاخیار میں درج کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء قاضی ضیاء الدین سنامی کے مرضِ وفات میں مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے اور اس ملاقات کے فوراً بعد قاضی صاحب رحلت فرماگئے، حضرت نظام الدین اولیاء روتے تھے اور افسوس فرماتے تھے کہ:

''یک ذات بود حامی شریعت حیف نہ ماند'' (۱۹).

مگر مولانا ابوالوفا افغانی کی تحقیق یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت نظام الدینؒ اولیاء کا حوالہ درست نہیں، قاضی صاحب کی خلد آباد میں وفات ہوئی اور یہ واقعہ حضرت برہان الدین غریبؒ (وفات ۷۴۰ھ) کے ساتھ پیش آیا تھا، مولانا افغانی کی اطلاع کی بنیاد شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ شیخ زین کا مجموعہ ملفوظات ہے جس میں یہ واقعہ درج ہے اور بظاہر یہی روایت درست ہے (۲۰) اس کی تائید قاضی صاحب کے مزار و مدفن سے ہوتی ہے جو خلد آباد (نزد اورنگ آباد) میں ہے۔ کرنل مرزا بسم اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ (قاضی ضیاء الدین سنامی کی) ''قبر خلد آباد میں کالی مسجد کے پاس واقع ہے'' (۲۰ب)

قاضی صاحب کی اولاد

قاضی ضیاء الدین سنامی کے متعدد لائق وفائق صاحبزادے تھے، احمد علی خیر آبادی کا قول ہے:

''چندیں پسران لائق داشت یکے زین العابدین، پسرش قاضی معین الدین ایرجی۔''

ترجمہ: ان کے کئی لائق فائق بیٹے تھے، ایک زین العابدین جن کے بیٹے معین الدین ایرجی تھے۔ (۲۱)

(۱۹) اخبار الاخیار، ص ۱۲۴ (احمدی، دہلی: ۱۲۷۰ھ)

(۲۰) حاشیہ نزہۃ الخواطر، ص ۹۵۔ ۹۴، ج ۲ (حیدر آباد: ۱۴۰۷ھ)

(۲۰ب) تذکرہ قاریان ہند ص ۹۷ حصہ دوم (کتب خانہ میر محمد، کراچی، بلاسنہ)

(۲۱) قصر عارفاں، احمد علی خیر آبادی، ص ۱۸۱، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (لاہور: ۱۹۶۵ء)۔۔۔۔ ایرج نواحِ سلطان پور (مشرقی یوپی) کی ایک بستی ہے۔

دو صاحبزادے میر عبد الواحد بلگرامی کی اطلاع کے مطابق قاضی سنامی کی حیات کے آخری ایام میں چند دنوں کے وقفہ سے وفات پاگئے تھے۔(۲۲)

منجملہ صاحبزادگان کے ایک بیٹے امام حاج کے نام سے مشہور تھے، ان کا صحیح نام معلوم نہیں، ان کے بیٹے تاج الدین تھے جو امام تاج کے نام سے متعارف تھے، تاج الدین کے فرزند قاضی کریم الدین مذکر ہوئے اور یہ بھی امام قاضی کریم الدین کے عنوان سے پہچانے جاتے تھے، جیسا کہ محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے اور ان کے بیٹے بھی امام کے نام سے موسوم ہوئے۔

قاضی کریم الدین مذکر کا جیسا کہ اوپر گذر گیا ہے، کاندھلہ میں منصب امامت کے لئے انتخاب و تقرر ہوا تھا، قاضی کریم الدین مذکر کا اس عہد کی بعض تحریروں میں مجمل تذکرہ ملتا ہے۔ مگر ان کے حالات اور تفصیلی معلومات دستیاب نہیں، قاضی کریم الدین مذکر کاندھلہ میں مفوضہ خدمات انجام دے رہے تھے، اسی دوران ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) سے پہلے کسی وقت قاضی کریم الدین کی وفات ہوگئی۔ اسی زمانہ میں محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کاندھلہ کے نواح میں پہنچا، اس وقت مولانا کریم الدین مذکر کے بیٹے مولانا محمد والد کی جگہ مقرر کئے گئے، اس کے بعد یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد میں جاری رہا۔

قاضی محمد کے ایک بیٹے مولانا قاضی بہاء الدین تھے۔ ان کے کئی بیٹے ہوئے، شیخ حافظ ولی محمد عرف ماہن، شیخ محمد عرف مامن، مولانا نور محمد عرف بابن شاہ، اس دور کی مجمل یادداشتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں عالم فاضل، صاحبِ کمال شخص تھے۔

مولانا نور محمد بابن شاہ کے نام کے ساتھ طالب علم کی بھی صراحت ہے۔ یہاں طالب علمی سے رسمی طالب علم مراد نہیں بلکہ وہ شخص مراد ہوتا ہے جس کا مستقل مشغلہ اور مصروفیت پڑھنا پڑھانا ہو۔

مولانا شیخ نور محمد تقریباً سنہ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں یا اس کے بعد کسی وقت کاندھلہ سے

(۲۲) سبع سنابل، میر عبد الواحد بلگرامی، ص ۶۲ (نظامی، کانپور: ۱۲۹۹ھ)

جھنجھانہ منتقل ہوئے، اس کی وجہ بظاہر وہ چار سو ستر بیگہ آراضی مدد معاش تھی جو اکبر کے فرمان کے مطابق ان کو نواح جھنجھانہ میں عطا کی گئی تھی، کیونکہ اکبر نے اپنے ایک اور فرمان کے ذریعہ مدد معاش پانے والوں کو پابند کر دیا تھا کہ وہ انہی مقامات پر قیام کریں جہاں ان کی اراضی مدد معاش ہیں۔

شیخ نور محمد کے تین صاحبزادے ہوئے، مولانا شیخ جمال محمد، شیخ کمال محمد اور منظور عرف گھاسی شیخ کمال کی کسی اولاد کا ہمیں علم نہیں، شیخ منظور کے اخلاف کیرانہ منتقل ہو گئے تھے مگر شیخ جمال محمد کاندھلہ میں ہی فروکش رہے، مولانا جمال محمد کے فرزند ارجمند مولانا محمد اشرف تھے، جو غالباً دادا صاحب کی قربت و پاسداری کی وجہ سے جھنجھانہ میں قیام فرماتے تھے مگر مولانا محمد اشرف نے بھی اپنی بیٹیوں کے نکاح کاندھلہ میں کیے۔

اس خاندان کا جھنجھانہ سے عارضی تعلق

مولانا محمد اشرف اس خانوادہ کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے جھنجھانہ میں مستقل اقامت فرمائی، مولانا محمد اشرف کے اخلاف کا تین نسلوں تک جھنجھانہ میں قیام رہا، لیکن جس طرح مولانا محمد اشرف کی صاحبزادی کا نکاح کاندھلہ اپنے خاندان کی شاخ میں ہوا تھا، اسی طرح بعد کے اصحاب کے بھی کاندھلہ سے نکاح و ازدواج کے مراسم قائم رہے، مفتی الٰہی بخش کے جد مولانا حکیم قطب الدین کاندھلہ واپس آگئے تھے، یہیں مولانا شیخ الاسلام کی ولادت ہوئی۔ اس طرح:

پہنچے وہیں جناب جہاں کا خمیر تھا

خانوادۂ مولانا حکیم قطب الدین کی جھنجھانہ سے کاندھلہ واپسی

حکیم عبد القادر کی اہلیہ محترمہ کاندھلہ کی تھیں اور مولانا حکیم قطب الدین کا نکاح بھی اسی خاندان میں بی بی خورم دختر شیخ محمد ضیاء الحق خلف مولانا شیخ محمد مدرس سے ہوا تھا، دونوں خاندانوں میں قریبی روابط کا اس نقشہ سے بہتر طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے:

شیخ محمد ضیاء الحق کی مولانا محمد مدرس کی حیات میں وفات ہوگئی تھی اور ان کی اکلوتی اولاد ایک بیٹی، بی بی خورم تھیں، اس لئے اپنی خوشدامن کے اصرار پر مولانا حکیم قطب الدین جھنجھانہ کی سکونت ترک کر کے کاندھلہ آگئے تھے، یہیں مولانا حکیم شیخ الاسلام تولد ہوئے اور اس طرح یہ خانوادہ چار نسلوں کے بعد جھنجھانہ سے کاندھلہ واپس پہنچا۔

اس خاندان کے بزرگوں کے حالات اور کتابیں نہ ملنے کی وجہ

افسوس ہے کہ مولانا حکیم عبد القادر سے مولانا حکیم شیخ الاسلام تک ان تینوں نسلوں کے افراد کے نام کے علاوہ کچھ معلوم نہیں اور اس سے پہلے بزرگوں سے متعلق بھی بہت کم معلومات دستیاب ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی الٰہی بخش کے والد مولانا شیخ الاسلام کا تمام علمی ذخیرہ اور اکثر خاندانی دستاویزات و کاغذات بلکہ مکانات و رہائش گاہ تک کئی مرتبہ لوٹ مار کا شکار ہوئیں اور نذر آتش کی گئیں۔

سب سے بڑا نقصان اس وقت ہوا جب احمد شاہ ابدالی کا لشکر اس علاقہ سے گذرا، اور اس نے اس علاقہ کے تمام باشندوں کیساتھ سخت ناروا سلوک کیا۔ اکثر سامان لوٹ لیا، کتابوں، کاغذات اور مکانات کو آگ لگادی، جس کی وجہ سے یہ سب لوگ اپنے علمی ذخیروں اور قدیم اندوختوں سے محروم ہوگئے، بلکہ اپنے رہائشی مکانات اور زمینوں کی ملکیت ثابت کرنے کے لئے بھی نئ

دستاویزات اور تازہ ثبوت کے محتاج رہے۔ اس المیہ کا مولانا شیخ الاسلام کی کئی تحریروں میں تذکرہ ہے، ایک استغاثہ میں جو احمد شاہ ابدالی کی یلغار کے فوراً بعد تحریر کیا گیا، لکھتے ہیں:

"چکوک و اسناد مذکورہ در ہنگامۂ احمد شاہ درانی کہ دریں سال ۱۱۷۳ھ (اہل) قصبہ کاندھلہ مذکور را بقتل رسانید، بہ غارت و احراق آمدند۔ ہر کہ برصحت ایں حال و صدقِ ایں مقال اطلاع و آگاہے بود، باید کہ گواہی ود بریں قرطاس ثبت نماید۔"

ترجمہ: مذکورہ دستاویزیں اور سندات احمد شاہ درانی کے ہنگامہ میں (جس نے) اسی سال ۱۱۷۳ھ میں قصبہ کاندھلہ کے لوگوں کو قتل کیا، تباہ ہوگئیں جل گئیں، جو شخص بھی اس واقعہ کی صحت کا گواہ ہو اور اس طلاع کی صحت سے واقف وباخبر ہو، اسے چاہئے کہ اس تحریر پر اپنی شہادت درج کردے۔

اس حادثہ کے موقع پر تمام قدیم خاندانی علمی ذخیرہ اور جملہ قدیم کاغذات ودستاویزات ضائع اور تلف ہوگئے تھے اور جو چند چیزیں باقی تھیں وہ بعد کے حوادث میں فنا ہوگئیں۔ ایک مرتبہ سکھوں نے قصبہ پر یورش کی، دوبارہ جاٹوں نے تباہی مچائی، تیسری مرتبہ جب ان بیرونی حملوں سے کچھ امن وامان ہوا تو مقامی تھانہ کے سپاہیوں نے ظلم وزیادتی کا معاملہ کیا، مولانا شیخ الاسلام کے گھر کو لوٹ کر سب ساز وسامان اور جملہ کاغذات تہس نہس کردیئے۔ (۲۸)

ان مسلسل اور پے در پے حوادث کی وجہ سے قدیم خاندانی ورثہ تقریباً نیست ونابود ہوگیا تھا۔ (۲۹) اس دور کی یا اس سے پہلے کی جو تحریریں یا کاغذات اس وقت موجود ہیں، یہ وہ ہیں جو اس وقت یا تو حکیم الاسلام کی تحویل میں نہیں تھیں، یا ان کے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ رکھی ہوئی تھیں، لیکن معلومات کی کمی کے باوجود یہ بات ثابت ہے کہ مولانا محمد اشرف سے مفتی الٰہی بخش تک اس خاندان کے اکثر افراد دین وشریعت کی واقفیت اس پر عمل اور اسکی تبلیغ وتدریس اور نشرواشاعت میں اپنے اپنے زمانہ میں ممتاز اور اہل کمال کا مرجع تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

(۲۸) کاندھلہ کی تاریخ پر راقم سطور کی مفصل کتاب میں انشاء اللہ ان تاریخی واقعات کا معتبر دستاویزات اور حوالوں کے ساتھ مفصل تذکرہ آئے گا۔

(۲۹) مفتی الٰہی بخش نے بھی مقدمہ شرح سلم العلوم میں اپنے علمی ذخیرہ اور تمام کاغذات کے ضائع ہونے پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد اشرف جھنجھانویؒ

شیخ جمال محمدؒ نے وسط گیارہویں صدی ہجری میں وفات پائی۔ ان کے صرف ایک فرزند حضرت مولانا محمد اشرف تھے جو اپنے کمالاتِ علمی، روحانی عظمت اور اخلاق و معرفت کی بلندی کی وجہ سے اشرفِ زمانہ ہوئے، مولانا محمد اشرف کے عہد طفولیت تعلیم اور اساتذہ سے متعلق معلومات کا فقدان ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ممتاز ترین علماء میں شمار کئے جاتے تھے، اور اس زمانے کے مشائخ واکابر کی نظر میں فخر اقران تھے۔

مولانا محمد اشرف کے کمالِ علم اور بلند مقامی کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی جیسے نادرۂ روزگار علماء، استفادہ اور ملاقات کیلئے مولانا کے پاس آتے رہتے تھے اور ان کے دور میں جھنجھانہ میں موجود ممتاز ترین علمی و روحانی شخصیتیں مثلاً شیخ عبد الرزاق جھنجھانوی کے فرزندانِ عالی مقام شیخ ابونصر جمال محمد اور ابوالکرم مزکی محمد، مولانا محمد اشرف کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور ایسی کتابوں اور تصنیفات کو جو ان صاحبان کی فرمائش اور نگرانی میں لکھی گئیں تھیں مولانا اشرف کی نظر سے گذارنا بڑی سعادت اور اعتماد و کمال کی سند خیال کرتے تھے (۲۳)

مولانا محمد اشرف علم و عمل کی طرح فقر و توکل اور استغنا اور استقامت میں بھی فردِ فرید تھے، مولانا کے جو حالات معلوم ہیں ان میں ان کے استغناء اور استقامت کا یہ واقعہ قابل ذکر اور لائق تقلید ہے۔

شاہجہاں نے مولانا محمد اشرف کے کمالاتِ علم و عمل کا شہرہ سنا تو مولانا کو دہلی آنے کی دعوت دی، مولانا کی تشریف آوری کے لئے پالکی اور رفاقت سفر کے لئے سپاہیوں کا ایک دستہ جھنجھانہ کے لئے روانہ کیا، مولانا کو اس کا علم ہوگیا کہ شاہی قاصد شان و شوکت کے

---

(۲۳) اس خیال کی تصدیق قاضی حفظ اللہ صدیقی قریشی بڑھانوی کی سیرت پر فارسی میں ضخیم تالیف مشکوٰۃ الانوار فی سیرۃ النبی المختار علیہ ﷺ کی تمہید سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب حضرت شاہ عبد الرزاق صاحب کے صاحبزادگان کے اصرار پر شاہ جہاں کے عہد میں لکھی گئی تھی اور اس میں حضرت مولانا محمد اشرف کے اس کتاب کی تصحیح فرمانے کا بہت اہتمام سے تذکرہ ہے اور مولانا کو غیر معمولی بلند الفاظ میں یاد فرمایا گیا ہے۔ اس گراں مایہ کتاب کا ایک عمدہ خطی نسخہ مجھے محترمی جناب توفیق احمد صاحب علوی مرحوم کی عنایت سے حاصل ہوا تھا، جو خانوادہ مفتی الٰہی بخش کے لئے ایک گراں مایہ تحفہ اور بیش بہا یادگار ہے۔

ساتھ ان کو لینے آرہے ہیں تو اس سے پہلے کہ ان لوگوں سے مولانا کی ملاقات ہوتی، مولانا خاموشی کے ساتھ پیادہ پا جھنجھانہ سے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ دہلی پہنچ کر اپنے متوسل ایک امیر کے ذریعہ سے بادشاہ سے ملاقات کی، شاہجہاں نے اپنے وزیر اعظم علامی سعد اللہ خاں کو مولانا کے فضل و کمال کا امتحان لینے کا اشارہ کیا، سعد اللہ خاں نے مولانا سے مختلف علمی مسائل پر مفصل گفتگو کی، اور ہر موضوع پر مولانا کو بے مثال و یگانہ پایا، تو بادشاہ سے کہا:

"شیخ را دریائے یافتم کہ کنارۂ او پیدا نیست۔" ترجمہ: شیخ کو میں نے ایسا دریا پایا ہے جس کا کنارہ معلوم نہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے مولانا کی خدمت میں دو ہزار بیگہ زمین کا فرمان پیش کیا مگر مولانا نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کی اور فرمایا:

"خدا رزاق ما است، نہ بادشاہ، من برائے عمل بر آیت حکم "اطیعوا الله واطیعوا الرسول واُولی الامر منکم، آمدہ بودم، نہ برائے تحصیل املاک۔"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہمارا رزاق ہے، بادشاہ نہیں۔ میں آیت شریفہ "تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور تم میں جو اہل حکومت ہیں ان کا بھی" پر عمل کرنے کی نیت سے آیا تھا، جائیداد حاصل کرنے نہیں آیا۔

بعد میں وہ فرمان مولانا کے صاحب زادوں اور ورثاء کے نام منتقل ہوا۔ یہ واقعہ ۲۶؍شوال سنہ جلوس ۲۰ مطابق ۱۰۵۶ھ کا ہے۔ یہ اصل فرمان ہمارے خاندان میں ابھی قریب تک موجود تھا، راقم نے دیکھا ہے، اس کی مصدقہ نقل جو عالمگیر اورنگ زیب کے دربار کی مصدقہ ہے ہنوز اب تک موجود ہے۔

مولانا کے استغنا اور توکل کا ایک اور مثالی واقعہ مولانا محمد ساجد جھنجھانوی (متوفی ۱۲۰۸ھ) نے اپنی بیاض میں نقل کیا ہے جس کا خلاصہ و ترجمہ یہ ہے کہ:

"مولانا کے یہاں اخلاص و تنگ دستی کا بسیرا رہتا تھا حالانکہ ارشاد و تلقین اور درس و تدریس کی وجہ سے طلباء اور آنے جانے والوں کا جم غفیر رہتا تھا، ایک مرید کو جو سونا بنانا جانتا

تھا مولانا کے اس فقر و تنگدستی کا احساس ہوا وہ تقریباً دو سیر سونا لیکر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں کیمیا جانتا ہوں، آپ کے یہاں فقر و فاقہ رہتا ہے، بادشاہ کے عطیات اور وظیفہ قبول نہیں فرماتے اس لئے میں یہ سونا طلباء کے خرچ کے لئے لایا ہوں۔ مولانا نے فرمایا، اس کو مسجد میں دفن کر دو، ضرورت ہو گی تو لے لوں گا، مرید نے وہ سونا مسجد کی محراب میں دفن کر دیا اور مولانا کے یہاں سے رخصت ہو گیا، کچھ عرصہ بعد لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ حالات پہلے سے بھی گئے گذرے ہیں، اس حال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مولانا کی خدمت میں عرض کیا، اگر وہ سونا خرچ ہو گیا ہے تو اور موجود ہے، مولانا نے فرمایا کہ محراب میں دیکھ لو! دیکھا تو جو سونا مرید دفن کر کے گیا تھا وہ اسی طرح موجود ہے، مرید سونے اور اپنے عطیہ کی ناقدری سے غمگین و ملول ہوا اور مولانا سے عرض کیا، آپ اس کی قدر نہیں کرتے، لوگ کیمیا کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، اگر اجازت ہو تو کچھ اور سونا حاضر کروں، مولانا اس وقت مسجد سے باہر ایک ڈھیلے سے استنجا خشک کر رہے تھے اس کی یہ بات سن کر وہ ڈھیلا ایک پتھر پر مارا جو اسی وقت سونے میں تبدیل ہو گیا، اس وقت مولانا نے اس مرید کو مخاطب کر کے فرمایا:

"ایں ہر دو را بہ خانہ خود ببر، فقر ما برائے متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم فقر اختیاری است نہ اضطراری"

ترجمہ: ان دونوں کو اپنے گھر لیجاؤ، ہمارا فقر و فاقہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں فقر اختیاری ہے، فقر اضطراری نہیں ہے۔

مولانا محمد اشرف کی صحیح تاریخ وفات دریافت نہیں، تاہم بعض دستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) کے قریب مولانا کی وفات ہو چکی تھی، مزار جھنجھانہ میں موجود ہے۔

مولانا محمد اشرف کے دو صاحبزادے تھے محمد شریف اور عبد المقتدر (۲۴) مؤخر الذکر کے متعلق اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں کہ ان کی وفات شوال ۱۰۹۵ھ سے پہلے ہو گئی تھی۔

(۲۴) اس سے پہلے میں ایک اور مضمون میں عبد المقتدر کا سنہ وفات ۱۰۹۶ھ لکھ چکا ہوں۔ (شیخ الحدیث کے اجداد، صحیح نسب نامہ اور حالات "الفرقان" لکھنؤ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نمبر، جلد اول، ص ۶۰) مگر بعد میں ایک اور دستاویز نظر سے گذری جو شوال سنہ ۱۰۹۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس میں بھی عبد المقتدر کو مرحوم لکھا ہے۔

مولانا محمد شریف جھنجھانویؒ

مولانا محمد شریف بھی اپنے والد ماجد کی طرح جید فاضل علم و سلوک کے رہ نورد اور خاندانی روایات کے جامع و امین تھے سنہ ولادت اور تعلیم موجود نہیں، بظاہر اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، مزید تفصیلات راقم سطور کو میسر نہیں آئیں۔

راقم سطور نے اپنے پچھلے دو مضامین میں مولانا محمد شریف کو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کا شاگرد لکھا ہے اور شطاریہ سلسلہ کے طریقہ تعلیم و تربیت پر ان کی متعدد کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ:

> "میں نے ہر چند تلاش و جستجو کی مگر کسی تحریر و یادداشت اور نسب نامے یا کسی اور ماخذ سے جھنجھانہ کے رہنے والے کسی ایسے عالم کا نام نہیں ملا، جن کا نام محمد شریف ہو، جو مولانا محمد شریف کے ہم عہد (بھی) ہو اس لیے قرین قیاس ہے کہ مولانا محمد شریف ہی ان کتابوں کے مترجم و مؤلف ہیں، بہر حال یہ پہلو مزید تحقیقات و معلومات کا متقاضی ہے"

بعد میں صوفیائے چشت کے ایک کم یاب قلمی تذکرہ "چشتیہ بہشتیہ" سے معلوم ہوا کہ صوفی محمد شریف جھنجھانوی جو شیخ وجیہ الدین گجراتی کے شاگرد اور سلسلہ شطاریہ پر کئی کتابوں کے مؤلف نیز سنسکرت کی متعدد کتابوں کے مترجم ہیں الگ شخصیت ہیں اور ان کا بظاہر حضرت مولانا محمد اشرف اور ان کے خاندان سے کچھ تعلق نہیں، لیکن یہ عنوان اس وقت تک ناتمام اور مزید معلومات و تحقیق کا منتظر ہے۔

مولانا محمد شریف خلف محمد اشرف جمادی الآخر ۱۰۸۸ھ (جولائی ۱۶۷۷ء) تک حیات تھے، تاریخ وفات معلوم نہیں۔

تالیفات و تراجم: مولانا نے اپنی پوری زندگی، عبادت و افادہ، درس و تعلیم اور تصنیف و ترجمہ کی خدمات اور سلسلہ شطاریہ کی تعلیمات عام کرنے میں بسر فرمائی۔ مولانا کی جد و جہد سے شیخ وجیہ الدین کے افادات و تحقیقات کا دائرہ عام ہوا اور اس کے فوائد و ثمرات دور دور

تک پہنچے۔

اولاد واحفاد: مولانا محمد شریف کے تین صاحبزادے ہوئے، مولانا شیخ ابوالحسن جو لاولد تھے۔مولانا حکیم عبد القادر جو حضرت مفتی الٰہی بخش اور اس خانوادہ کے جد ہیں اور فیض محمد جو حضرت مولانا محمد الیاس وغیرہ کے پرداداتھے۔حکیم عبد القادر کے دو فرزند تھے: قطب الدین، شرف الدین۔حکیم قطب الدین کا نکاح مسماۃ خورم بنت شیخ ضیاء الحق خلف مولانا محمد مدرس کاندھلوی سے ہوا، جن سے تین بیٹے مولانا محمد عرف شیخ الاسلام،حکیم صدر الدین (۱) محمد مشائخ اور تین بیٹیاں تولد ہوئیں۔

مولانا حکیم شیخ الاسلام نے کئی نکاح کیے، متعدد اولادیں ہوئیں پہلی زوجہ بی بی عظمت النساء حضرت مفتی الٰہی بخش کی والدہ ماجدہ ہیں۔مفتی صاحب کے تین بھائی اور تھے مولانا شاہ محمود بخش، مولانا شاہ کمال الدین، مولانا امام الدین مولانا محمود بخش کے تعلیمی سلسلہ کی تفصیل معلوم نہیں مگر آخری کے دونوں بھائی حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے خاص شاگرد تھے، جن کے علم اور صلاحیت کا اساتذہ کرام کو بھی اعتراف رہا۔ مولانا امام الدین نے بہت کم عمر پائی عین نوجوانی میں انتقال ہوگیا تھا،

---

(۱) حکیم صدر الدین عالم فاضل شخص تھے،ان کے ایک بیٹے شمس الدین، دوسرے عبد الغنی تھے۔ شمس الدین کے فرزند مولانا حکیم سبحانی تھے جو اپنے دور کے ممتاز فاضل جید طبیب اور علوے مرتبہ اور معرفت میں کامل تھے،ان کو حضرت سید احمد شہید۔سے اجازت بیعت حاصل تھی ملاحظہ ہو:

کاروان ایمان وعزیمت (تذکرہ خلفاء حضرت سید احمد شہید) از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۰۸ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)۔

حکیم غلام سبحانی کے ایک فاضل بیٹے مولوی حکیم فیض الحق جھنجھانوی تھے،ان کی طب پر متعدد تصانیف معلوم ہیں ''مستقصی الکلام فی امراض الانام'' معالجات پر نہایت جامع مبسوط تالیف ہے،اس کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے،دوسرا نسخہ جو مصنف کے قلم سے ہے،ایک ذاتی ذخیرہ میں میری نظر سے گذرا ہے،تقریباً آٹھ سو صفحہ کا مخطوطہ ہے طب پر ان کی ایک اور کتاب فارسی میں، فتاویٰ طب ہے جو شائع ہو چکی ہے، راقم سطور کے پاس اس کے چند صفحات کا فوٹو اسٹیٹ موجود ہے۔

شمس الدین بھی فاضل طبیب تھے اور ان کے فرزند امام بخش اچھے شاعر ہوئے، مشہور تخلص کرتے تھے۔ امام بخش مشہور کی بیاض (جس میں ان کا اور ان کے معاصرین حضرت مفتی الٰہی بخش، سودا، رنگین جرات اور دوسرے شعراء کا کلام بھی درج ہے) ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

مولانا محمود بخش اور مولانا شاہ کمال الدین تقویٰ پرہیز گاری اتباع سنت اور ارشاد و معرفت میں مشہور زمانہ اور نامور شیخ تھے۔ حضرت مفتی الٰہی بخش کا مختصر تذکرہ اور احوال آئندہ صفحات میں آرہے ہیں۔

حضرت مفتی الٰہی بخشؒ

ولادت، طفولیت و تربیت اور ابتدائی تعلیم: حضرت مفتی الٰہی بخش ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۸ـ۴۹ء) میں پیدا ہوئے، صحیح تاریخ دریافت نہیں، بچپن وطن میں گذرا، والدین کے سایہ میں پرورش و تربیت پائی، قرآن پاک حفظ کیا اور فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں متوسطات تک والد ماجد سے اخذ کیں، تذکرہ مفتی الٰہی بخش میں ہے: (۳۰)

"تا سن تمیز بہ کنار والدین ماجدین وپدر مادر خود جناب مولوی محمد مدرس رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، بہ ہزاراں ناز ونعم پرورش یافتند۔"

ترجمہ: زمانۂ شعور تک والدین ماجدین اور اپنے نانا مولوی محمد مدرس (ان سب پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں) کے آغوش میں ہزار ناز و نعمت سے پرورش پائی۔

مفتی صاحب کے مولانا محمد مدرس[۳۱] کاندھلوی سے تلمذ کی بے بنیاد روایت

مفتی صاحب کے اپنے والد بزرگوار مولانا محمد عرف شیخ الاسلام سے تعلیم و تربیت پانے

(۳۰) تذکرہ مفتی الٰہی بخش، مفتی الٰہی بخش کے پرپوتے مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان خلف مولانا نور الحسن ابن مولانا ابوالحسن بن مفتی الٰہی بخش (ولادت جمادی الاول ۱۲۵۷ھ۔ جولائی ۱۸۴۱ء، وفات ۱۳۲۵ھ۔ ۷؍ فروری ۱۹۰۸) کی تالیف ہے۔ اصل تالیف اردو میں ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا فارسی ترجمہ مثنوی مولانا روم کے مشہور مرتب و مصحح اور ناشر مولانا احمد حسن کانپوری نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ محرم ۱۳۲۲ھ میں مطبع محمود المطابع کانپور سے اختتام مثنوی مؤلفہ حضرت مفتی الٰہی بخش کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا ہے۔ ضمیمہ بڑے سائز کے ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، چونکہ مولانا سلیمان کے مرتبہ اردو تذکرہ کا مکمل نسخہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اس ترجمہ پر اعتماد کیا گیا۔ آئندہ صفحات میں اس ترجمہ کا تذکرہ مفتی الٰہی بخش کے نام سے ذکر کیا جائے گا۔

۳۱۔ مولانا محمد مدرس، دسویں صدی ہجری کے ممتاز عالم، نامور فقیہ اور مدرس تھے۔ تقریباً ستر سال تک درس و افادہ کا بازار گرم رکھا۔ کثرت درس و تعلیم کی وجہ سے مدرس کے لقب سے مشہور تھے۔ کم از کم دو مرتبہ حج کی سعادت پائی اور علماء حرمین سے استفادہ کیا۔ طویل عمر پائی، تقریباً ۱۰۸۸ھ تک حیات تھے۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔ مولانا کے صرف ایک فرزند تھے شیخ ضیاء الحق جو نوجوانی میں انتقال کر گئے تھے، ان کی بیٹی بی بی خورم مولانا محمد شیخ الاسلام کی والدہ ماجدہ تھیں۔

کی اطلاع ہر پہلو سے صحیح اور لائق تسلیم ہے، مگر یہ اطلاع درست نہیں کہ مفتی صاحب نے مولانا محمد مدرس کے آغوشِ تربیت میں تربیت پائی ہے، اور یہ بھی صحیح نہیں کہ مولانا محمد مدرس مفتی الٰہی بخشؒ کے نانیہالی اجداد میں تھے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا شیخ محمد مدرس مفتی الٰہی بخشؒ کی دادی بی بی خورم کے جد تھے، سلسلہ نسب اس طرح ہے: "بی بی خورم بن ضیاء الحق بن مولانا محمد مدرس۔"

مولانا محمد مدرس مفتی الٰہی بخش کی ولادت (۱۱۶۲ھ) سے کم از کم چوہتر سال قبل (شوال ۱۰۸۸ھ۔۱۶۷۷ء) میں یا اس سے بھی پہلے رحلت فرما گئے تھے۔ اس لئے مفتی صاحب کے ان سے تلمذ بلکہ مولانا محمد مدرس کو دیکھنے کی روایت بھی قطعاً غلط اور ناقابل تسلیم ہے۔

مفتی صاحب نے مولانا محمد عرف شیخ الاسلام سے کیا کیا کتابیں پڑھیں، اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی لیکن مفتی صاحب کی تحریرات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کاندھلہ سے دہلی کے سفر کے وقت متوسطات کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔

تعلیم کے لئے دہلی کا سفر: متوسطات کی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لئے معمول کے مطابق کئی بڑے اساتذہ اور ممتاز علماء پر نظر گئی ہوگی، اس وقت علم و تدریس کی کثرت اور بلند پایہ علماء کی موجودگی کی وجہ سے دہلی رشک بغداد و بخارا بنا ہوا تھا، خصوصاً آخری دور کے امام حضرت شاہ ولی اللہ کے وجود سے علم کی ایسی شمع روشن تھی جس کی کرنوں سے آفتاب و ماہتاب شرمندہ تھے۔ بہرحال اس مجمع علماء و مرکز علم و فضل سے استفادہ کے لئے دہلی کا سفر ہوا، اس سفر کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، مولانا محمد سلیمان نے لکھا ہے کہ اس وقت مفتی صاحب کی عمر چودہ سال تھی۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ سفر ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں ہوا ہوگا، اور قرین قیاس ہے کہ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ حیات ہوں (۳۲) کیونکہ اس وقت تک شاہ عبدالعزیز کے نامِ نامی سے شاہ ولی اللہ کے شاگردوں اور متعلقین کے علاوہ کوئی اور واقف بھی نہ تھا، بہر صورت یہ شاہ ولی اللہ کی زندگی کے آخری ایام تھے، اس لئے حضرت شاہ صاحب سے تعلیم و تلمذ کا موقع نہیں ملا، ممکن ہے تبرکاً کچھ پڑھا ہو، لیکن مفتی صاحب کے زمانۂ طالب علمی کی لکھی ہوئی

(۳۲) تذکرہ مفتی الٰہی بخش، ص ۸۱

وہ بیاضیں جن میں اس دور کے احوال و متعلقات درج ہیں میری نظر سے نہیں گذری، مفتی صاحب کی جو تحریریں اس وقت تک میری نظر سے گذری ہیں، ان میں شاہ ولی اللہ سے براہ راست تلمذ کا کوئی اشارہ نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات ۲۹؍ محرم ۱۱۷۶ھ (۳۳) کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ نے مسند درس وافادہ کو زینت بخشی اور سب سے پہلے جو چار پانچ طالب علم شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقہ درس سے فیضیاب ہوئے اس میں مفتی الٰہی بخش شامل تھے۔ عبدالرحیم ضیاء لکھتے ہیں:

"مگر آپ (شاہ عبدالعزیزؒ) نے مستقل بجز چار پانچ شخصوں کے اوروں کو بہت کم پڑھایا ہے" (۳۴)

مفتی صاحب نے شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں کن کتابوں سے درس کا آغاز کیا اس کی تصریح نہیں ملی، مگر مفتی صاحب کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافیہ وغیرہ متوسطات سے حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں اسباق شروع کئے تھے، کافیہ سے درس کی اعلیٰ ترین کتابوں تک ایک ایک کتاب کی سند مفتی صاحب نے اپنی بیاض میں قلم بند کی ہے، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے مفتی صاحب کو جو سند عطا فرمائی اس میں صراحت ہے کہ اِنھوں نے شروع سے آخر تک تمام کتابیں میرے روبرو عرض کیں:

لما تلمذ عندی بدراسة صغار الکتب الی کبارھا ومبادی نسخ التحصیل الی اواخرھا.

ترجمہ: جب میرے پاس چھوٹی کتابوں سے بڑی کتابوں تک درس کے ابتدائی نصاب سے آخر تک سب کچھ پڑھ لیا، اور ....

ممکن ہے کہ مفتی صاحب نے آغاز کافیہ وغیرہ سے کیا ہو اور بعد میں ان سب کتابوں کا

(۳۳) مفصل معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: راقم سطور کا مضمون "شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تاریخ وفات اور ان کے اہل خاندان کے مزارات اور ان کے کتبے" ماہنامہ "برہان" دہلی، جولائی ۱۹۸۳ء، جلد ۹، شمارہ ۱۔

(۳۴) مقالاتِ طریقت یا فضائل عزیزیہ۔ عبدالرحیم ضیا۔ (حیدرآباد: ۱۲۹۲ھ) نیز "نزہۃ الخواطر" مولانا سید عبدالحی حسنی، ص ۲۶۹، ج ۷۔

بھی جو وطن سے پڑھ کر آئے تھے، شاہ صاحب کی خدمت میں تجدید واعادہ کرلیا ہو۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبد القادرؒ کے ہم سبق تھے: مفتی صاحب اکثر درسیات میں شاہ رفیع الدینؒ کے رفیق وہم سبق تھے، اس وقت شاہ عبد القادرؒ نسبتاً ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے، شاہ رفیع الدینؒ کے ساتھ آخر تک تمام کتابوں میں سماعت و قرأت کے ساتھ رفاقت رہی، مصابیح السنہ کے اسباق میں شاہ عبد القادرؒ بھی مفتی صاحبؒ کے ہم سبق ہوگئے تھے، غالباً کسی وجہ سے درس کی معمول کی ترتیب میں شاہ عبد العزیزؒ کی خدمت میں سنن ابوداؤد پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لئے سنن ابی داؤد اپنے رفیقِ درس شاہ عبد القادرؒ سے پڑھی۔ شاہ عبد العزیزؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وسمع المصابيح بقرأة الاخ الارشد العالم الصالح الشيخ عبد القادر وقرأ عليه سنن ابى داؤد."

ترجمہ: مصابیح میرے نیک بھائی، عالم وصالح شیخ عبد القادر کی قرأت سے سنی اوران (ہی) سے سنن ابوداؤد پڑھی۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی عطا فرمائی ہوئی سند: تعلیم سے فراغت پر حضرت شاہ عبد العزیز نے اپنے دست مبارک سے مفصل سند لکھ کر مفتی صاحب کو عطا فرمائی، اس میں زیر درس کتب کی تفصیل کے علاوہ مفتی صاحب کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت وصلاحیت، معقولات ومنقولات کے فہم واستحضار کی تصدیق کے علاوہ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

"فعرف معانى المتون ودقائقها واصطلاحات الحديث واحوال اسانيده، حتى تيسر له ملكة التقاة المطالب من الشروح والحواشى بحيث يعتمد على فهمه و يقبل ماصدر من رأيه.

وصار بحمد الله فاضلاً جيداً

ترجمہ: پس متون کے مفہوم ان کی باریکیوں اور اصطلاحات حدیث واسانید کو پہچانا، یہاں تک ان میں شروح وحواشی سے مطالب اخذ کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی سمجھ (اور صلاحیت) پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اوران کی رائے قبول کی جاسکتی ہے۔

یہ بفضلہٖ تعالیٰ نہایت جید فاضل اورممتاز

وعالماً بارعاً، ذا تقویٰ وصلاح وخشية من الله ومحبته والاستقامة في شريعته واهلاً لان يعتمد على فتاويه وأجوبته مع فضائل آخر

عالم ہو گئے ہیں، نیکی پرہیز گاری والے، اللہ سے ڈرنے، محبت کرنے والے، اس کی شریعت پر جمے ہوئے اور اس کے اہل کہ ان کے فتوؤں اور جوابات پر اعتماد کیا جائے، مع اور فضائل اور کمالات کے۔

مفتی صاحب شاہ عبد العزیزؒ کی نظر میں: شاہ صاحب نے مفتی صاحب کے استعداد، اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت اور جن محاسن و کمالات کا مذکورہ بالا سند میں تذکرہ کیا ہے، یہ وقتی تذکرہ یارسمی کارروائی نہیں تھی بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب مفتی صاحب کو اپنا شاگرد کہتے ہوئے مسرت محسوس کرتے تھے اور اپنی مجلسوں میں مفتی صاحب کے کمالِ علم اور علوئے مرتبہ کا بلند الفاظ میں تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔ ایک مجلس میں ارشاد ہوا:

"در شاگردانِ من دوکس خوب بودند چنانچہ مولوی رفیع الدین و مولوی الٰہی بخش" (۳۵)

میرے شاگردوں میں دو شخص بہت عمدہ ہوئے، مولوی (شاہ) رفیع الدین اور مولوی مفتی الٰہی بخش۔

اور یہ بھی شاہ صاحب کے کمالِ اعتماد کی علامت ہے کہ جب نواب ضابطہ خاں نے حضرت شاہ عبدالعزیز سے اپنی ریاست کی سرپرستی کرنے اور مفتی اعظم کی حیثیت سے ریاست میں قیام فرمانے کی درخواست کی تو شاہ صاحب نے اس سے معذرت کی، مگر ضابطہ خاں کا بار بار اصرار ہوا تو شاہ صاحب نے اپنے نمائندہ اور قائم مقام کی حیثیت سے مفتی الٰہی بخش کو منتخب فرمایا کر ریاست میں بھیج دیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں سفر سلوک اور اجازت و خلافت

مفتی صاحب نے درسیات کے علاوہ سلوک و تصوف کی متعدد اہم تصنیفات اور دیگر فنون کی اہم کتابیں سبقاً سبقاً شاہ صاحب سے پڑھیں اور مراتب عرفان و سلوک کی علمی واقفیت

(۳۵) ملفوظات فارسی، ص ۴۰۔ ۳۹ (میرٹھ: ۱۳۱۴ھ)

کے علاوہ اصلاحِ باطن اور سلوک و تصوف کی عملی تربیت بھی حاصل کی۔ مفتی صاحب جن کے حسنِ اخلاق، پاکیزہ عادات و کردار کا شاہ صاحب ان الفاظ میں تذکرہ فرما چکے تھے:

وهبه الله تعالیٰ من حسن الاخلاق وطیب الشیم (۳۶)

ترجمہ: ان کو اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ اخلاق اور عمدہ خصلتیں عطا فرمائی ہیں۔

شاہ صاحب کے حلقہ اصلاح و تربیت سے وابستہ ہوئے اور مراحل سلوک مکمل کرنے کے بعد اجازت و خلافت سے مشرف کیے گئے۔

مفتی صاحب کو شاہ صاحب سے اجازت و خلافت کب عطا ہوئی اور مفتی صاحب کا شاہ صاحب کی خدمت میں کب تک قیام رہا اس کی تاریخ میرے علم میں نہیں، لیکن مختلف قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) تک شاہ صاحب کی خدمت میں دہلی میں قیام تھا، یعنی دس سال شبانہ روز شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے اور استفادہ کی سعادت میسر رہی۔

اپنے چھوٹے بھائی مولانا شاہ کمال الدین کاندھلوی سے بیعت استفادہ اور اجازتِ بیعت

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دریائے کمال سے استفادہ کے بعد مفتی صاحب نے مسند درس وافادہ کو زینت بخشی، مفتی الٰہی بخش کی ذاتِ گرامی شاہ صاحب کے محاسن و کمالات کا پرتو اور شاہ ولی اللہؒ کے طریقہ تعلیم و تربیت اور علوم و کمالات کی جامع اور مکمل نمونہ تھی، اس لئے مفتی صاحب کے حلقہ درس وارشاد میں طلباء اور طالبانِ راہ حق کا کثرت سے رجوع ہوا، طلباء کی کثیر تعداد اور ارشاد و معرفت کے طالبین گروہ در گروہ مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی اپنی صلاحیت و ظرف کے مطابق حسب توفیق استفادہ کرتے۔ اس کثرتِ رجوع اور استفادہ کی وجہ سے مفتی صاحب علمی روحانی حلقوں میں ممتاز اور ہندوستان کے دور دراز گوشوں

(۳۶) یہ تمام اقتباسات اس مفصل سند کے ہیں جو خود حضرت شاہ عبدالعزیز کے قلم سے (جس پر مہر بھی ثبت تھی) مفتی صاحب کی اس بیاض میں درج ہے جو ان کی حدیث کی بیاض اور زمانہ تعلیم کی اہم ترین یادگار ہے۔ یہ بیاض امید ہے محفوظ ہوگی، مگر راقم سطور کو اس کی زیارت اور اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ اس بیاض سے یہ سند مولانا احتشام الحسن نے مفتی الٰہی بخش کی تالیف شرح قصیدہ بانت سعاد کے پیش لفظ میں نقل کی ہے (ص ۳۔۲، دہلی: ۱۳۵۴ھ) مقدمہ بانت سعاد سے "حالاتِ مشائخ کاندھلہ" (ص ۵۵۔۵۳) میں نقل ہوئی ہے۔ یہاں تمہید بانت سعاد سے اخذ کی گئی ہے۔

میں متعارف ہو گئے تھے، مگر مفتی صاحب کی شخصیت کی جن عناصر سے تشکیل ہوئی تھی اور ان کو جن برگزیدہ شخصیتوں کے فیضِ صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا اس کے اثرات سے مفتی صاحب کی ذات کا جوہر اس قدر صیقل ہو گیا تھا اور اپنی ذات کی نفی اور نفس کے مکائد پر غور و فکر کی عادت ایسی پختہ ہو گئی تھی کہ مرشد کامل اور تلامذہ و متوسلین کی فراوانی کے باوجود ہمیشہ ایسے اصحاب کی جستجو رہتی تھی جو معرفت کی نوردی اور علمی و عملی خصوصیات میں ممتاز و منفرد ہوں، جس صاحب کمال کا علم ہوتا اس کے پاس جاتے اور جس صاحب ارشاد و سنت بزرگ کا علم ہوتا ان سے اپنے مقام و حیثیت کا ایک لمحہ احساس کئے بغیر عام طالبین حق اور معمولی افراد کی طرح استفادہ کرتے، ان کے ملفوظات قلم بند کرتے اور ان کے روحانی کمالات سے فیضیاب ہوتے تھے (۳۷)

اسی دوران سلسلہ نقشبندیہ کے طریقہ پر سیر سلوک کا اور اس سلسلہ کے کمالات حاصل کرنے کا خیال آیا، اس قصد سے متعدد بزرگوں اور اہل طریقت سے رجوع کیا، مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ کہیں نہیں ملی، اسی کشمکش کے زمانہ میں بھوپال کے اطراف کے ایک سفر میں ایک درویش کامل سے ملاقات ہوئی، اس نے کہا جب تک اپنے بھائی شاہ کمال الدین سے بیعت ہو کر استفادہ نہ کرو گے تمہارا مقصد حاصل نہ ہو گا (۳۸)

جس چھوٹے بھائی کی بچپن میں تربیت کی ہو اور سبقاً سبقاً تمام کتابیں پڑھائی ہوں، اس

---

(۳۷) متعدد مشائخ و صوفیاء کے نام اور ان کے مختلف افادات مفتی صاحب کی بیاضوں میں درج ہیں۔ ایک بڑے بزرگ شاہ محمود بخش (غالباً جھنجھانوی) کے ملفوظات بھی کتابی صورت میں مرتب کئے تھے۔

(۳۸) شاہ کمال الدین مولانا محمد عرف شیخ الاسلام کے بیٹے مفتی الٰہی بخش کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، ابتدائی درسیات و متوسطات مفتی صاحب کے حلقۂ درس میں اور اعلیٰ کتابیں حضرت شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین سے پڑھیں۔ نہایت درجہ متبع سنت، بے ریا، بے نفس شخص تھے۔ سلوک و معرفت میں اس عہد کے نامور مرشد حضرت شاہ ابو العدل خلیفہ و جانشین حضرت خواجہ محمد زبیر نقشبندی مجددی سے بیعت کی اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شاہ ابو العدل کی وفات (۱۲۰۴ھ) کے بعد شاہ صاحب کے خلیفہ و جانشین مقرر ہوئے۔ شاہ ابو العدل کے مقام و مرتبہ کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خلفاء و تربیت یافتگان میں شاہ عبد القادر مفسر قرآن بھی شامل ہیں۔ شاہ کمال الدین کی ۱۲ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (۴ اکتوبر ۱۸۲۷ء) بروز پنجشنبہ کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ بعد میں مفتی الٰہی بخش بھی ان کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

سے بیعت ہونے کا فیصلہ آسان نہیں تھا، مگر مفتی صاحب فنائیت اور اخلاص کے ایسے مقام پر فائز تھے کہ اس مشورہ کو ماننے قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ مفتی صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی شاہ کمال الدینؒ سے عام متوسل ومسترشد کی حیثیت سے رجوع ہونے کا فیصلہ فرمالیا، چھوٹے بھائی شاہ کمال الدینؒ سے عقیدت اور خوش دلی کے ساتھ بیعت کی اور اجازت وخلافت پائی۔

مفتی صاحب کا شاہ کمال الدین سے بیعت واستفادہ کا تعلق کب ہوا، اس کی صراحت نہیں ملی۔ مولانا محمد سلیمانؒ اس کو شاہ عبد العزیز کی وفات (۱۲۳۹ھ) کے بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں، مگر مجھے اس کی تصدیق میں تامل ہے کیوں کہ مفتی صاحب کی تحریرات میں ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۶ء) کے بعد بھوپال اور اس کے نواح کے کسی سفر کا اشارہ وتذکرہ نہیں ہے۔ مفتی صاحب تقریباً ۱۲۱۲ھ بھوپال سے ترکِ ملازمت کر کے تشریف لائے تھے، اس کے بعد بھوپال اور اطرافِ بھوپال کے کسی سفر کا مفتی صاحب کی تحریرات ویادداشتوں میں تذکرہ بلکہ اشارہ تک نہیں ہے اور خود مولانا سلیمانؒ نے لکھا ہے کہ:

"آخر الامر در اثناء سفر بھوپال بعارفے ملاقی شدند۔" (۳۹)	آخر کا بھوپال کے سفر میں ایک مرد کامل سے ملاقات ہوئی۔

مفتی صاحب کی عمر کے (وفات ۱۲۴۵ھ) آخری سولہ سترہ سال مسلسل وطن میں گذرے، اس دوران کسی بیرونی طویل سفر کی کوئی یادداشت (اس وقت تک دستیاب) بیاضوں میں تحریر نہیں، اور جو اطلاعات ہیں وہ اسی وقت کی ہیں جب مفتی صاحب ریاستِ بھوپال میں ملازم تھے اور مختلف حیثیتوں سے بھوپال کے اطراف جانا آنا رہتا تھا، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ شاہ کمال الدین سے ارادات وبیعت کا واقعہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی حیات میں پیش آیا ہو، ممکن ہے اس میں شاہ عبد العزیزؒ کا منشاء اور اجازت بھی کار فرما رہی ہو، مفتی صاحب نے شاہ عبد العزیزؒ کی وفات (۱۲۳۹ھ) کے بعد اٹھتر اناسی سال کی عمر میں بھوپال کا طویل سفر کیا ہو اور اس سفر سے واپسی کے بعد یعنی ۱۲۴۰ھ میں شاہ کمال الدینؒ سے بیعت ہوئے ہوں، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

(۳۹) تذکرہ مفتی الٰہی بخش، ص۸۹، نیز حالات مشائخ کاندھلہ، ص۲۰

حضرت سید احمد شہیدؒ سے استفادہ

شاہ کمال الدین سے بیعت واستفادہ کے بعد خانوادۂ ولی اللہی اور نقشبندیہ مجددیہ سلسلوں کا فیضان مفتی صاحب میں جمع ہو گیا تھا، گویا مفتی صاحب کی ذات مجمع البحرین ہو گئی تھی، مگر ابھی مفتی صاحب کو اور دور تک جانا تھا، اس لئے سفر کا آغاز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اشارہ وایماء پر حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ سے ارادت ووابستگی سے ہوا، جو اس دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لئے روشن مستقبل کی نوید تھے۔

سید صاحب ۱۲۳۴ھ میں اطراف دہلی کے تبلیغی سفر پر نکلے تھے۔ اسی سفر کے دوران کاندھلہ بھی تشریف لائے اور مفتی صاحب کے مکان پر فروکش ہوئے۔ مفتی صاحب نے سید صاحب کے کمالاتِ باطنی کا اندازہ فرمالیا تھا اس لئے بلا تامل سید صاحبؒ سے بیعت ہو کر ان کے علوم وکمالات سے مستفید ہوئے۔ نیز مفتی صاحب نے اپنے قریبی رشتہ داروں خلفاء اور مریدین کو بھی سید صاحب کے دامن تربیت میں دے دیا تھا سید صاحبؒ نے بھی مفتی صاحب کو اجازت وخلافت سے نوازا اور اپنے طریقۂ سلوک وتربیت کی تفصیلی تعلیم فرمائی۔

جب سید صاحبؒ کاندھلہ سے اگلی منزل کے لئے روانہ ہوئے، اس وقت مفتی صاحب بھی سید صاحب کے ہمراہ تھے، اس دوران مفتی صاحب نے سید صاحب کے ملفوظات اور طریقۂ تعلیم کو مرتب ومنضبط فرمایا تھا یہ مجموعہ افادات ''ملہمات احمدیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (۴۰)

(۴۰) ملاحظہ ہو: ملہمات احمدیہ تالیف مفتی الٰہی بخش (طبع اول: آگرہ)

منصب افتاء پر پہلا تقرر اور مفتی کا خطاب

مفتی صاحب جس زمانے میں تعلیم پا رہے تھے اس وقت علماء کے درمیان مختلف علمی دینی مسائل بحث و مباحثے اور مجمع عام میں مذاکرہ اور تبادلہ خیالات ایک عام معمول تھا، حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی مجلس میں بھی اس قسم کے مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ شاہ صاحب کی عادت شریفہ یہ تھی کہ بحث و مذاکرات کے وقت چند کلمات فرما کر خاموش ہو جاتے اور اپنے ممتاز شاگردوں میں سے جن طلباء کی صلاحیت پر خاص اعتماد ہوتا اس گفتگو کو مکمل کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔

ایسی ہی ایک بحث کے موقع پر نواب نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خان بھی موجود تھا، وہ اس مجلس میں مفتی صاحب کی گفتگو، عالمانہ دلائل، موضوع پر ماہرانہ گرفت اور ذہانت و ذکاوت سے ایسا متاثر ہوا کہ پھر ضابطہ خان کی نگاہ میں کوئی نہ جنچا۔ ضابطہ خاں نے اسی وقت فرمائش کی کہ اس نوجوان عالم کو میری ریاست میں مذہبی معاملات کی نگرانی اور صدر مفتی کی حیثیت سے عطا فرما دیجئے۔ اس وقت تو شاہ صاحب نے معذرت فرما دی اور کہا "تعلیم مکمل کر لیں اس وقت دیکھا جائے گا۔" جب شاہ صاحب کے مدرسہ سے مفتی صاحب کے رخصت ہونے کا وقت قریب آیا اس وقت شاہ صاحب نے ضابطہ خاں کی فرمائش پر توجہ فرمائی اور اپنے نمائندہ اور قائم مقام کی حیثیت سے مفتی صاحب کو ضابطہ خاں کی ریاست سے وابستہ ہونے کی ہدایت کی۔ یہ واقعہ بہ ظاہر ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) نجیب الدولہ کی وفات کے فوراً بعد کا ہے اس وقت ضابطہ خاں کا مرکز ریاست (غوث گڈھ) علماء اور اہل کمال کا مرجع و مجمع بنا ہوا تھا، مفتی صاحب غوث گڈھ تشریف لے گئے اور بہت اعزاز و وقار کے ساتھ مفتی اوّل کے عہدہ پر فائز رہے، اس وقت سے مفتی کا خطاب مفتی الٰہی بخشؒ کے نام کے ساتھ اس طرح وابستہ و منسلک ہوا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔

مفتی صاحب نے غوث گڈھ کی مرہٹوں کے ہاتھوں تباہی سے تقریباً ایک سال پہلے غوث گڈھ کا قیام اور خدمت افتاء کا تعلق ختم کر لیا تھا اور بہ ظاہر پہلے سے اس کی تحریک اور

کوشش ہو رہی ہوگی، اسلئے بلا تاخیر کوٹہ راجستھان تشریف لے گئے۔مفتی صاحب کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ربیع الاول ۱۲۰۰ھ (جنوری ۱۷۸۶ء) میں کوٹہ میں قیام تھا (۱) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوٹہ کے دورانِ قیام میں درس وافتاء اور سلوک و معرفت کی خدمات میں ہمہ وقتی مصروفیت تھی، اس کے باوجود کوٹہ کا قیام مختلف حیثیتوں سے غوث گڈھ کے قیام سے بہتر گذرا، کوٹہ کے قیام کے دوران لکھی ہوئی مفتی صاحب کی جو تحریرات میری نظر سے گذری ہیں ان میں نشاط و سرور کی اک خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے، یہ بات اور تحریروں میں نظر نہیں آتی۔

کوٹہ سے رشتۂ ملازمت ختم ہونے پر بھوپال کا سفر کیا، بھوپال روانگی کا عہد متعین کرنے کا کوئی قرینہ نہیں، قیاساً یہ سفر سنہ ۱۲۰۵ھ (۹۱۔۱۷۹۰ء) کے قریب ہوا ہوگا۔تقریباً چھ سال بھوپال میں مفتی ریاست کے عہدہ کو زینت بخشی اور وسط ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) میں بھوپال سے واپس آگئے تھے۔ بھوپال سے واپسی کے بعد وقفہ وقفہ سے تھانہ بھون، بڈھانہ اور اطراف کی چند بستیوں میں کم وزیادہ قیام رہا۔اسی زمانہ میں کچھ وقت کاندھلہ میں بھی گذرا، اور ایک روایت کے مطابق کاکوری میں بھی قیام رہا (۲) تقریباً ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) میں نواب احمد خاں کے اصرار پر سہارنپور تشریف لے گئے اور اواخر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) تک وہیں قیام فرماتھے۔اس دوران بھی درس وتدریس، اصلاح وتربیت اور تصنیف و تالیف کا کام پوری قوت اور زور وشور سے جاری رہا، مختلف حواشی مرتب کئے، بے شمار فتاویٰ لکھے اور ممتاز فاضل تیار فرمائے۔

سہارنپور سے واپسی کے بعد وطن میں مستقل قیام رہا وقتی اسفار کے علاوہ (جس میں مختلف قرابتوں کی وجہ سے تھانہ بھون جانا رہتا تھا اور کبھی کبھی طویل قیام ہوتا تھا) کسی اور جگہ مستقل قیام کا سلسلہ نہیں رہا، اگر ہمارا یہ اندازہ صحیح ہے تو زندگی کے آخری تقریباً سولہ سال کاندھلہ میں قیام

---

(۱) ریاست سے باضابطہ تعلقات ختم ہونے کے بعد کم سے کم ایک مرتبہ غوث گڑھ جانے کا مفتی صاحب کی تحریروں میں تذکرہ ہے، یہ سفر ربیع الثانی ۱۲۰۰ھ کی آخری تاریخوں میں ہوا، اس موقع پر یکم جمادی الاول ۱۲۰۰ھ (مارچ ۱۷۸۶ء) حضرت شاہ عبدالغنی (برادر حضرت شاہ عبدالعزیز) بھی وہاں تشریف لائے تھے۔

(۲) تذکرہ مشاہیر کاکوری، تالیف مولوی حیدر علی کوکوروی، ص ۳۹ طبع اول (لکھنؤ) میں تحریر ہے کہ (مولانا شمس الدین کاکوروی نے) مفتی الٰہی بخش کو اپنے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ کو پڑھانے کے لئے بلا کر رکھا تھا مگر مفتی صاحب کی کسی یادداشت اور تحریر میں کاکوری جانے کا تذکرہ نہیں ملا۔

رہا اور یہاں بھی یہ دریائے فیض اسی جوش وخروش سے جاری رہا، بلکہ یہاں پہنچ کر اس کی وسعت میں غالباً کچھ اضافہ ہی ہوگیا تھا۔

مفتی صاحب کے اوقات کا ایک ایک لمحہ درس، تعلیم، مطب، افتاء، وعظ وارشاد، تذکیر وتعلیم اور اصلاح وتربیت میں گذرتا تھا۔ تصنیف وتالیف جو مفتی صاحب کو بہت عزیز تھی (اور مختلف علوم وفنون پر تالیفات کا خاصا وسیع ذخیرہ مرتب فرمایا تھا) اب درس کی مصروفیات اور آنے جانے والوں کی کثرت اور اخلاق وتربیت کی گرم بازاری کی وجہ سے بہت کم ہوگئی تھی، مشغولیات اس قدر متنوع تھیں، آنے جانے والوں کی اس قدر کثرت تھی کہ تصنیف وتالیف کا یہ مبارک سلسلہ کم ہوتے ہوتے آخر میں بالکل ختم ہوگیا تھا۔ مولانا ابوالحسن کاندھلوی نے اس حقیقت کا یوں اظہار فرمایا ہے:

شغل باطن کا ہوا یہ اہتمام — رہ گیا دفتر وہ بالکل ناتمام
اس قدر تدریس کی کثرت ہوئی — ایک لمحہ کی نہ پھر فرصت ہوئی
گذرے جب تصنیف پر چالیس سال — کر گئے وہ اس جہاں سے انتقال (۳)

بوئے گل در برگِ گل: اوپر گذرگیا ہے کہ مفتی صاحب شاہ ولی اللہؒ کے آخری ایامِ حیات میں یا ان کی وفات کے فوراً بعد دہلی پہنچے اور شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں کی سب سے پہلی اور ممتاز ترین جماعت میں شامل ہوئے اور نو دس سال تک شبانہ روز شاہ عبد العزیزؒ کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے۔ اس وقت شاہ ولی اللہؒ کے خاص تربیت یافتہ افراد میں سے خصوصاً شاہ محمد عاشقؒ اور دوسرے حضرات دہلی میں موجود تھے دوسری طرف مرزا مظہر جانجاناںؒ جیسی عالی مرتبت شخصیت اور ان کے خلیفہ شاہ غلام علی بھی تشریف فرماتھے۔ اس کے علاوہ دہلی میں اور بھی اہل روحانیت اور بلند پایہ علماء تھے جن کا چرچا اور فیضان دور دور تک پھیلا ہوا تھا، مفتی صاحب نے ان سب کی صحبت اٹھائی، سب کے علوم وکمالات سے فائدہ اٹھایا اور ان کے محاسن وخصوصیات کا عطر اپنی ذات میں اس طرح بسایا کہ خود مفتی صاحب کی شخصیت گل صد برگ اور مجمع البحرین بن گئی تھی۔ بالخصوص حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے کردار طریقہ

(۳) مجمع فیض العلوم، ترجمہ منظوم مثنوی مولانا روم، دفتر اول۔ ص ۲۱۔ (مطبع ہاشمی، میرٹھ۔)

تعلیم و اصلاح، خدمت دین و شریعت، پیروی قرآن و سنت اور جملہ علوم و کمالات کا رنگ مفتی صاحب کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گیا تھا گویا مفتی صاحب کی ذات حضرت شاہ صاحبؒ کے کمالات کا آئینہ بن گئی تھی۔ حضرت الاستاذ سے غیر معمولی الفت و مناسبت کا لازمی اثر اور حضرت شاہ صاحب کے تلمذ کا حق تھا کہ مفتی الٰہی بخش ان کے طریقہ کو اپنی زندگی کا مقصد اور ان ہی خدمات کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتے جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا معمول تھا۔

مفتی صاحب نے بھی اپنی زندگی کا سفر اسی راستہ پر طے فرمایا جو شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہؒ کا مقرر کیا ہوا اور پسند کیا ہوا راستہ تھا، مفتی صاحب کی شاہ عبدالعزیزؒ نے اس طرح تربیت فرمائی تھی کہ مفتی صاحب کی شخصیت شاہ عبدالعزیز کے کمالات کا اعلیٰ ترین نمونہ اور تمام علمی دینی، اصلاحی، درسی تعلیمی اور تصنیفی خدمات میں شاہ عبدالعزیز کا ثنیٰ بن گئی تھی۔ وہی درس و تعلیم کی گرم بازاری، وہی فقہ و فتاویٰ کی خدمت، وہی درسِ قرآن و حدیث کا شغف، وہی دعوت اتباع سنت کی لگن، وہی بدعات و رسوم کے خلاف مسلسل جدوجہد، وہی شیعیت اور باطل نظریات کے خلاف زبان و قلم سے مہم اور ایسا ہی علوم میں کمال، ایسی ہی جامعیت اور تبحر علمی۔

درس و افادہ: مفتی صاحب کے حلقۂ درس و تعلیم کا آغاز زمانۂ تعلیم میں ہو گیا تھا۔ اس کا اہتمام خود حضرت الاستاذ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا تھا، شاہ صاحب نے ہدایت فرمائی کہ ان کی موجودگی میں درسی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھائیں، چنانچہ مفتی صاحب شاہ صاحب کی موجودگی میں طلبہ کو درس دیتے تھے، شاہ صاحب بنفس نفیس تشریف رکھتے اور توجہ کے ساتھ مفتی صاحب کے طرز تعلیم اور فن سے مناسبت و مہارت کا مشاہدہ اور نگرانی فرماتے تھے، جب حضرت شاہ صاحب کی نگرانی و تربیت نے مفتی صاحب کی ایک ایک خوبی کو خوب جانچ پرکھ لیا اور ہر امتحان میں کامیاب پایا تو مفتی صاحب کو اجازت مرحمت فرمائی کہ اب وہ اپنا حلقہ درس قائم کریں، دینی رہنمائی اور فقہ و سنت کے ذریعہ مخلوق کی خدمت فرمائیں۔

مولانا محمد سلیمان لکھتے ہیں:

"(شاہ عبد العزیز) نقد فضل و کمال ایشاں را بر محکِ امتحاں می سودند، چوں کامل العیار یافتند وزر خالص دانستند پس حضرت، ایشاں را رخصت فرمودند کہ بطور خود سلسلہ درس وافتاء جاری دارند وفیضِ تدریس وافتاء بہ خلق اللہ رسانند۔"

ترجمہ: شاہ عبد العزیز نے ان کے فضل وکمال کی پونجی کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھ لیا، جب اعلیٰ معیار کا پایا اور اس کا خالص سونا ہونا واضح ہو گیا تو حضرت نے ان کو رخصت کر دیا کہ اپنے طور درس اور فتاویٰ لکھنے کا کام کریں اور اپنے درس و فتاویٰ (کے ذریعہ) سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچائیں۔

مفتی صاحب نے اس شاہراہ پر قدم جمائے تو زندگی کے آخری دنوں تک نہایت ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس پر رواں دواں رہے، طرح طرح کے حالات پیش آئے، مختلف ملازمتوں کا سلسلہ بنا اور ختم ہوا۔ وقتاً فوقتاً دور دراز کے سفر بھی ہوئے یقیناً صحت و مرض کے مسائل بھی سامنے آئے ہوں گے، ذاتی مسائل اور غیر متوقع مصائب نے بھی قدم پکڑے ہوں گے مگر مفتی صاحب کی تحریرات بیاضیں اور ہر دور میں اچھے طالب علموں کی موجودگی کی اطلاعات بتا رہی ہیں کہ کسی وقت بھی درس وافادہ کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔

مفتی صاحب کی زندگی کا جو حصہ غوث گڈھ، تھانہ بھون وغیرہ میں گذرا وہ اس نواح میں حد درجہ کی بے اطمینانی اور افراتفری کا دور تھا۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی، چاروں طرف سے یورشیں ہوتی رہتی تھیں، کبھی مرہٹے قتل و غارت گری کرتے، کبھی سکھوں کے حملے ہوتے اور کبھی جاٹ گروہ در گروہ آتے اور مسلمانوں کی بستیوں، محلوں اور گھروں کو برباد و تاراج کر جاتے تھے، مفتی صاحب کے قریب ترین رشتہ دار، والد ماجد، بھائی اور خانہ بھی کئی مرتبہ اس حادثے سے دوچار ہوئے، گھر لوٹا اور جلایا گیا، کئی مرتبہ قدیم علمی اثاثہ غارت کیا گیا مگر مفتی صاحب کی پیشانی پر شکن نہیں آئی وہ اسی دل جمعی اور استقلال کے ساتھ علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے، نہ ان کی کتابوں میں اس کا واویلا ہے، نہ ان کی تحریرات پر اس کا اثر۔

مفتی صاحب کے مستقل حلقۂ درس کا غالباً ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں آغاز ہوا تھا اور

۱۲۴۵ھ میں وفات سے ایک دن پہلے تک بلاناغہ اور وقفہ کے جاری رہا، یعنی متواتر ساٹھ سال اس خدمت دین میں بسر فرمائے اور اگر اس زمانۂ تدریس کو بھی شمار کیا جائے جب مفتی صاحب شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ میں شاہ صاحب کی موجودگی میں سبق پڑھاتے تھے تو یہ مدت تقریباً تریسٹھ سال ہو جاتی ہے، اس طویل عرصہ تک ذاتی نفع و نقصانات سے بے پروا ہوکر تندہی سے اس عظیم خدمت کی بجاآوری اپنی جگہ ایک مستقل کرامت اور بڑا کارنامہ ہے۔

نصاب تعلیم کا تذکرہ: مفتی صاحب کے درس میں رائج مکمل نصابِ تعلیم بارہ علوم کی پچھتر کتابوں پر مشتمل تھا، اس نصاب کے علاوہ طب کی ابتداء سے انتہاء تک تمام کتابیں حدیث وتفسیر کی وہ بنیادی اہم کتابیں جو معمول کے نصاب میں شامل نہیں تھیں، نیز تصوف کی بارہ چودہ کتابیں اس نصاب کے علاوہ زیر درس رہتی تھیں۔ اگرچہ معمولی نصابِ تعلیم میں اس وقت کے معیار و طریق کے مطابق معقولات کا خاصہ حصہ تھا، اور اس نصاب کے ساتھ معقولات کی تعلیم ہوتی تھی، مگر مفتی صاحب کا اصل ذوق درس تفسیر وحدیث وفقہ کا تھا، منقولات نہایت ذوق وشوق سے پڑھاتے تھے، اور خود سے کبھی بھی کسی طالب علم کو معقولات پڑھنے کا مشورہ نہیں دیتے تھے، مگر جو طلبہ یا اہل علم معقولات (منطق، فلسفہ، کلام وغیرہ) کی کتابیں پڑھنا چاہتے تھے ان کو مایوس بھی نہیں فرماتے تھے۔ مولانا محمد سلیمان لکھتے ہیں:

"میلانِ طبع مبارک بسوئے دینیات زیادہ تر بود و از خود ہیچ کسے را ترغیب و تحریص معقولات نمی فرمودند، واگر کسے را شوق تحصیل معقولات پیدا می شد، در تعلیم آنہا ہم دریغ نمی فرمودند" (۴)

ترجمہ: طبیعت شریف کا رجحان زیادہ تر دینیات کی تعلیم کی طرف تھا اور کسی کو معقولات کے پڑھنے کی ترغیب نہیں دیتے تھے اگر کسی کو معقولات پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا، ان کو پڑھانے سے منع بھی نہیں فرماتے تھے۔

چند تلامذہ: جو حلقہ درس متواتر ساٹھ سال جاری رہا ہو، اس سے مجموعی طور پر کل

(۴) تذکرہ مفتی الٰہی بخش، ص ۸۱۔

کتنے طلباء وعلماء نے استفادہ کیا ہوگا اس کا شمار یقیناً ہزاروں میں ہوگا اگر کم از کم پندرہ بیس طلبا بھی ہر سال زیر تعلیم رہے ہوں تو ان کی مجموعی تعداد تقریباً ایک ہزار ہوگی، جب کہ مفتی صاحب کی متفرق یادداشتوں نیز ان کے بعض معاصرین و متاخرین کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کی خدمت میں ہر دور میں طلباء کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی، یہاں تک کہ سفر میں بھی طالب علموں کی جماعتیں ہم رکاب ہوتی تھیں، اس لئے بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب کے ہزارہا شاگرد تھے، مگر افسوس کہ نہ اُس وقت نہ بعد کے دور، میں ان کی کوئی یادداشت یا فہرست مرتب کی گئی، جس کی وجہ سے ہمیں مفتی صاحب کے صرف ۳۵۔۴۰ شاگردوں کے نام معلوم ہیں (۵) لیکن اس قلیل ترین تعداد میں (جس کو مشتے از خروارے کہنا بھی شاید صحیح نہ ہو) بھی متعدد ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر اک بڑے سے بڑے علماء کے حلقۂ درس کا امتیاز اور نامور اساتذہ کے لئے باعث فخر واعزاز ہوسکتا تھا، نمونہ کے طور پر چند تلامذہ کے نام درج ہیں:

۱۔ حضرت مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی (وفات ۱۲۶۰ھ) (۶)
۲۔ حضرت مولانا مرزا حسن علی (صغیر) محدث لکھنوی (وفات ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء)
۳۔ حضرت مولانا محمد حسن رام پوری (شہید بالاکوٹ، وفات ۱۲۴۶ھ)
۴۔ حضرت مولانا مغیث الدین سہارنپوری (شہید بالاکوٹ، وفات ۱۲۴۶ھ)
۵۔ حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی کاندھلوی (وفات ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء)
۶۔ حضرت مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری، (وفات تقریباً ۱۲۶۰ھ)
۷۔ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ چند اور شاگردوں کا ذکر آخر میں آرہا ہے۔

---

(۵) چوبیس شاگردوں کے نام مولانا محمد سلیمان نے تذکرہ مفتی الٰہی بخش میں درج کئے ہیں۔ (ص ۸۵ تا ۸۸) یہی نام حالات مشائخ کاندھلہ میں بھی نقل ہوئے ہیں، ص ۱۱۹، ۱۲۳، اس کے علاوہ جو نام ہیں وہ راقم سطور نے دریافت کئے ہیں۔

(۶) مولانا سید محمد قلند، مفتی صاحب کے ممتاز شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا مملوک العلی نانوتوی، قاری عبدالرحمان پانی پتی اور مولانا غوث علی قلندر پانی پتی جیسے ممتاز علماء کے استاذ تھے۔ تمام عمر درسِ حدیث کا سلسلہ رہا۔ ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی۔ مزید معلومات کے لئے راقم سطور کا مقالہ "حضرت حاجی امداد اللہ کے اساتذہ کرام" مشمولہ امداد المشتاق، مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی: ۱۹۸۲ء) ملاحظہ فرمائیں۔

فقہ و فتاویٰ

حضرت شاہ عبد العزیز کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک اہم امتیاز، شاہ صاحب کی فقیہانہ حیثیت و مقام تھا، جس فقہی عقدہ کی کسی اور سے گرہ کشائی نہ ہوتی وہ شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا اور لمحوں میں اس کا ایسا اطمینان بخش علمی اور جامع جواب ملتا کہ سب کو اطمینان ہو جاتا تھا۔ یہی کیفیت حضرت مفتی الٰہی بخش کی اس نواح میں تھی۔

مفتی صاحب نے فتویٰ نویسی اور فقہ میں مہارت کی تربیت اسی دربار سے پائی تھی، ایک مدت تک وہ فتاویٰ جو شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کئے جاتے، مفتی صاحب ان کے جوابات تحریر فرمایا کرتے۔ شاہ صاحب ان پر صرف دستخط اور مہر ثبت فرمایا کرتے تھے۔

مفتی صاحب کو فقہی موضوعات پر کیسی باریک گرفت اور اس کے مباحث و متعلقات کی تحقیق کا زمانۂ طالب علمی میں کس قدر ملکہ راسخہ حاصل ہو گیا تھا، اس کے لئے اس واقعہ کا حوالہ کافی ہے، جو تعلیم کے فوراً بعد ضابطہ خاں کے یہاں تقرر کا سبب ہوا۔

ضابطہ خاں جو نجیب الدولہ کا وارث اور علماء کی قدر دانی میں باپ کے قدم بقدم تھا، مفتی صاحب اس کی ریاست میں مفتی اول کے عہدہ پر فائز رہے، بعد میں کوٹہ، بھوپال اور سہارنپور وغیرہ میں افتاء کی عمومی خدمت مفتی صاحب کے سپرد رہی، اور ہمیشہ اپنی خداداد قابلیت اور استاد محترم کی کامل و مکمل رہنمائی کے سبب سرخ رو اور نیک نام رہے۔ مفتی صاحب کے فتاویٰ کا غالباً کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا (کم از کم راقم سطور کے علم میں نہیں ہے) مگر مفتی صاحب کے خود نوشت جو چند فتوے موجود ہیں، وہ فقہی بصیرت، وسعتِ نظر اور مہارت فن کے گواہ ہیں مفتی صاحب کی متعدد بیاضوں میں فقہی کتابوں کے ہزاروں اقتباسات موجود ہیں اور مختلف فقہی کتابوں پر طویل و کثیر حواشی جو فقہ سے مفتی صاحب کی مسلسل گہری وابستگی اور اس موضوع کے علمی ذخیرہ پر عالمانہ نظر کی منہ بولتی شہادت ہے۔

قلم اور شعر و ادب کے ذریعہ سے دینی اصلاحی خدمات

مفتی صاحب کو فقہ کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی بہت قدرت تھی اور برجستہ شعر

کہنا عام معمول تھا۔ مفتی صاحب نے ان دونوں صلاحیتوں (فقہ اور شعر گوئی) کے مرکب سے عامۃ المسلمین کے لئے ایسا مفید وجاں نواز نسخہ تیار فرمایا تھا کہ اس کے استعمال سے ہزارہا مسلمانوں کو شفا کی نوید ملی، احکامِ شریعت کی جانب رہنمائی ہوئی، عقائد معاملات اور معاشرہ کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوئی، یہ نسخہ شفا وہ چھوٹے چھوٹے رسائل تھے جو مفتی صاحب نے عقیدہ کی اصلاح، ضروری دینی احکامات ومسائل اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق مناسب اسلامی ہدایات اور معاشرت کی درستگی کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کے لئے مرتب ومنظوم فرمائے تھے۔

ان رسائل سے بہت فائدہ پہنچا، یہ گھر گھر پڑھے جاتے تھے، کثرت سے ان کی نقلیں لی جاتی تھیں اور ان کی روشنی میں اپنی اپنی اصلاح کی فکر ہوتی تھی۔ اس قسم کے متعدد رسالے اب بھی دریافت وموجود ہیں، لیکن مفتی صاحب کے قریب العہد بعض تذکرہ نگاروں کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کے اس قسم کے رسائل ومؤلفات کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی جو اب دستیاب نہیں دہلی ہریانہ وغیرہ میں بھی اسی دلچسپی اور شوق سے پڑھے جاتے تھے، جس قدر خود مفتی صاحب کے علاقہ اور نواح میں۔ کریم الدین پانی پتی لکھتا ہے:

"بہت کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسائل اردو زبان کے، ترویجِ مذہب امام ابو حنیفہؒ میں اس کے مشہور ہیں" (۷)

یہی مصنف اپنی دوسری مشہور ترین کتاب "طبقات الشعرائے ہند" میں رقم طراز ہے:

"مفتی الٰہی بخش جو بڑا عالم گذرا ہے، اس کی تصنیف سے اردو میں بہت رسالے مشہور ہیں" (۸)

علمی خدمات اور دینی جدوجہد کے چند اور پہلو: مفتی صاحب کی عملی زندگی اور دینی اصلاحی کوششوں کی روداد بھی ایسی ہی مسلسل اور سرسبز وشاداب ہے، جس سے ان کی

(۷) فرائد الدہر، تذکرہ شعرائے عربی، کریم الدین پانی پتی، ص ۳۸۷ (مطبع العلوم، دہلی: ۱۸۴۷ء نسخہ ذاتی)
(۸) طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی، ص ۳۹۳۔ (لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

علمی دینی تحریری تصنیفی زندگی عبارت تھی دعوتِ دین، وعظ و تلقین، ارشاد و تربیت، رسومات و بدعات کا خاتمہ، طریقۂ سنت کی تبلیغ و اشاعت ہمہ وقت جاری رہتی تھی، حضرت سید احمد شہید سے ارادت کے بعد اس ذوق میں گویا نئی جان پڑ گئی تھی اور یہ لگن بیش از بیش ہو گئی تھی، مفتی صاحب نے زبان و قلم، شعر و ادب اور تحریرات و مواعظ کے ذریعہ سے اس پورے خطہ میں دینی شعور کو تازہ کیا، پرانے طور طریقے جن میں سے اکثر پر ہندوؤں کے اثرات تھے اور صدیوں کے میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں در آئے تھے کوشش کر کے ختم کرائے، اپنے گھرانے اور خاندان کو خالص اسلامی طریقہ حیات پر لائے اور سب کو اسی مبارک راستہ پر ثابت قدم و کاربند رہنے کی تلقین فرمائی، یہی آواز عوام میں بھی بلند فرمائی گئی جس کا اثر ہوا اور بفضلہٖ تعالیٰ پوری بستی میں صحیح اسلامی شعار، عام مسلمانوں کا ذوق و مزاج بن گیا تھا، مفتی صاحب کی اسی جدوجہد کو مفتی صاحب کے شاگردوں اور خلفاء نے اپنے شاگردوں اور متوسلین کے ذریعہ سے قصبات و دیہات میں آگے بڑھایا، جس سے راہِ سنت کی لگن عام ہوئی اور چراغ سے چراغ جلتے گئے اور روشنی بڑھتی گئی۔

مغلوں کے آخری دور میں مختلف اسباب کی وجہ سے شیعہ مسلک کی تبلیغ کے دروازے کھل گئے تھے اور مغل ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں شیعیت، آندھی طوفان کی رفتار سے بڑھتی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے شاگردانِ کرام نے اس طوفان کے سامنے بند لگانے کی طاقتور تحریک و کوشش کی، جو حضرت شاہ عبد العزیز کے دست مبارک سے مکمل ہوئی۔ اس کوشش سے اس دریا کی روانی بند ہوئی، اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا، لیکن اس کوشش کے فوائد عوام اور اس سے نچلے طبقے تک پہنچانے کی بات تھی، جو اس وسیع علمی ذخیرہ سے شایانِ شان فائدہ اٹھانے سے قاصر تھا، اور اپنی سیاسی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے یا دوسروں کی دیکھا دیکھی تاریک راہوں کا مسافر بن گیا تھا۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے خلفاء اور تلامذہ نیز تحریک حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذریعہ یہ کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام پایا اور ملک کے اِس کونے سے اُس کونے تک ظلمت کی چادر پارہ پارہ

ہوتی نظر آئی، مفتی الٰہی بخش دونوں میخانوں کے جرعہ نوش تھے وہ شاہ عبدالعزیز کے اہم ترین شاگردوں اور تربیت یافتہ افراد میں سر فہرست اور ممتاز تھے، سید احمد شہیدؒ کے وابستگان میں بھی منتخب ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، اور ان نسبتوں کا حق بلکہ دینی فرض تھا کہ مفتی صاحب اس وادی میں سرگرم عمل ہوتے اور امت کو راہ راست پر لانے میں اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتیں خرچ فرماتے، مفتی صاحب نے اس فریضہ کی اعلیٰ پیمانہ پر بہت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دہی فرمائی، اس علاقہ میں شیعیت کے جو اثرات تھے ان کا وعظ وپند، فتاویٰ، مؤلفات ورسائل اور نظم ونثر کی صلاحیتوں کے ذریعہ بخوبی دفعیہ کیا۔ اس کوشش کے اثر سے اس نواح میں شیعیت کی چلتی لہر گویا تھم گئی تھی، جس کا بہت دیر تک مشاہدہ ہوتا رہا۔

شعروادب: مفتی صاحب کو مبدأفیاض سے منجملہ اور کمالات ومحاسن کے ادب کا ذوقِ لطیف بھی عطا ہوا تھا، مفتی صاحب نہایت موزوں طبع اور قادر الکلام شاعر تھے نشاط تخلص کرتے تھے، طبیعت ایسی پر بہار وروان تھی کہ ہر صنف سخن میں عربی، فارسی، اردو تینوں میں ہر وقت اپنی رعنائی اور کمالات کا نظارہ کراتی رہتی تھی۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مرثیہ ہر موضوع پر یکساں قدرت تھی اور اعلیٰ درجہ کا ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا۔

اردو شعر وزبان پر غیر معمولی قدرت کا گواہ ترجمہ مثنوی مولانا روم ہے، اس کا اسلوب تمام تر مثنوی مولانا روم کا اسلوب ہے، اس کی لے اتنی دھیمی، الفاظ کا تناسب اتنا حسین اور معانی کا تموج ایسا پر شور ہے کہ قاری کو مکمل طور سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، افسوس ہے کہ مفتی صاحب نے اس گرانمایہ کارنامہ کو مکمل کرنے کی فرصت نہ پائی، مگر مولانا ابوالحسن حسن نے جو "الولد سر لأبیه" کے مصداق تھے اس کو اسی رنگ، اسی انداز سے اختتام تک پہنچادیا، اس کے علاوہ اردو کلام کا ایک مستقل دیوان ہے، ایک دیوان اور تھا جس کو حضرت شاہ عبدالعزیز نے لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرمایا تھا اور اس پر منظوم تقریظ بھی تحریر فرمائی تھی، افسوس کہ یہ متاعِ گراں مایہ بے قدری کی نذر ہوگئی۔ اس کے علاوہ مفتی صاحب نے متعدد دینی، فقہی موضوعات اور عقائد نیز سنت وبدعت کے مسائل کو بھی اختصار سے مختلف نظموں اور قطعات میں نظم کیا ہے۔

یہی حال فارسی شعر وادب کا ہے، مفتی صاحب کا فارسی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے مفتی صاحب کی بیاضوں میں بلند پایہ فارسی شعراء کی غزلیات واشعار کا عمدہ انتخاب کئی موقعوں پر درج ہے، خود بھی فارسی میں شعر کہتے تھے، جس کا سب سے عمدہ اور اعلیٰ ترین نمونہ مثنوی مولانا روم کا اختتام یا تکملہ ہے، جس میں بقولِ مولانا قاری محمد طیب:

> ''مفتی صاحب نے مولانا روم کی لَے میں لَے اس طرح ملائی ہے کہ اصل اور تتمہ کا فرق ہی اٹھ گیا'' (۹)

اس کا ایک اور عمدہ نمونہ قصیدہ بانت سعاد کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ فارسی نظم میں مفتی صاحب نے دس بارہ کتابیں مختلف موضوعات پر مرتب فرمائیں، فارسی اشعار کا ایک مکمل دیوان الگ ہے۔

فارسی اور اردو کی طرح عربی ادب میں نثر نویسی اور شعر کا ذوق اسی معیار کا پایا ہے، مفتی صاحب کے ممتاز معاصرین اور تذکرہ نگار اس کمال فن کے قائل و معترف ہیں، (۱۰) اور مفتی صاحب کی تحریرات واشعار اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔

ذوقِ سلوک و معرفت: مفتی صاحب کا جس خانوادہ سے تعلق تھا، اس میں عرفان وسلوک اور سفر معرفت کی روایت نہایت گہری اور قدیم تھی، کئی نسلوں سے اکابر علماء اور ممتاز مرشدین سے وابستگی واستفادہ کا سلسلہ چلا آرہا تھا مفتی صاحب اپنی ذاتی خصوصیات، کردار کی پاکیزگی، بے نفسی اور اخلاص وانکسار کی وجہ سے اپنے استاذ اور بعد کے دور میں استاذ الکل حضرت شاہ عبد العزیز کی نگاہوں میں محبوب بنے، مفتی صاحب نے اس عنایت کو اپنے حق میں اکسیر جانا اور شاہ صاحب کی خدمت میں دل وجان سے لگ گئے، شاہ صاحب سے تصوف کی اعلیٰ ترین کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں، سلوک کے سب مرحلے ایک کے بعد ایک کر کے طے کیے اور جب کئی برس شبانہ روز استاذِ والاشان کی خدمت میں رہ کر رخصت ہوئے

---

(۹) تمہید بارات حرم منظومہ مولوی شبیر احمد جذبی کاندھلوی (کاندھلہ)

(۱۰) دیکھئے، **حدیقۃ الافراح**، شیخ احمد بن محمد یمنی شروانی، (مؤلف، نفحۃ الیمن وغیرہ) الباب السادس فی ادباء الہند والعجم، ص ۲۲۵،۲۲۸ (طبع اول، بندر، ہوگلی کلکتہ: ۱۲۲۹ھ) نیز تذکرہ فرائد الدہر (عربی شعراء وادباء کا احوال) ص ۳۸۷ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

تو استاذ محترم سے علم و تدریس کی اجازت کے علاوہ ارشاد و تربیت کی سند سے بھی مشرف تھے۔

مفتی صاحب نے اگرچہ پیر و مرشد کی ہدایت و اجازت کے مطابق ارشاد و تربیت اور بیعت کا سلسلہ جاری کیا، مگر ہمیشہ خود کو ناچیز اور مزید تربیت و نگرانی کا محتاج خیال کرتے رہے۔ یہی جذب و بے چینی ملک کے دوسرے خطوں میں لے گئی تھی۔ چنانچہ ارشاد و سلوک کے مختلف خانوادوں اور متعدد مشائخ سلوک سے ملاقاتیں اور استفادہ بھی ہوا، مگر دل میں جو آگ لگی ہوئی تھی اور قلب جس سکون کا متلاشی تھا وہ متاع کسی دوکان پر دستیاب نہ ہوئی، بالآخر جذبِ دروں نے چھوٹے بھائی کی خدمت میں پہنچادیا یہاں سے قادریہ نقشبندیہ کے طریقہ تعلیم اور نسبت الی اللہ کی راہ کھلی، مگر ابھی سفر باقی تھا، تڑپ بر قرار تھی جس نے سید احمد شہید کے دامن سے وابستہ کیا، یہاں سے طریقۂ سنت کے شبنمی قطرے دل پر برسے اس سے خاص طراوت پیدا ہوئی اور:

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا۔

مفتی صاحب اصلاح و تربیت میں یکتا اور فلسفہ تصوف، اس کے فنی اسرار و رموز، علمی مباحث کی استادانہ واقفیت، اس کی تفہیم و تشریح، اس کے مراحل و نکات کی درجہ بندی اور اس کی تعلیم و تلقین میں بھی فردِ فرید تھے اس میدان میں مفتی صاحب کی راسخ قدمی کا اختتام مثنوی مولانا روم سے خوب اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف اور اس کے مختلف گوشوں پر مفتی صاحب کی متعدد تالیفات یادگار ہیں۔

طب و معالجات میں خاص دسترس اور غیر معمولی کمال: منقولات و معقولات میں غیر معمولی مہارت و کمال کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب کو طب یونانی پر بھی غیر معمولی دسترس حاصل تھی، مفتی صاحب نے طب کی اکثر کتابیں اپنے والد ماجد مولانا محمد عرف حکیم شیخ الاسلام سے پڑھی تھیں، چند کتابیں حضرت شاہ عبد العزیز کے روبرو عرض کیں، نیز چند اور کتابیں اور غالباً علم طب کا تجربہ دہلی میں حاصل کیا تھا مفتی صاحب کی بعض تحریروں سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ حکیم محمد شریف خان (وفات ۱۲۱۶ھ (۱۱)) سے تلمیذانہ استفادہ کا تعلق رہا ہے،

(۱۱) حکیم شریف خاں کے سنہ وفات میں اختلاف ہے مگر مفتی صاحب نے حکیم شریف کا قطعۂ تاریخ وفات کہا تھا، یہ سنہ اسی سے مستفاد ہے اور یہی صحیح ہے۔

لیکن واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ مفتی صاحب کی بیاضوں میں حکیم علوی خاں اور شریف خاں وغیرہ کی بیاضوں سے بے شمار نسخے نقل ہیں، ان سے بھی مفتی صاحب کی شریف خاں کے سلسلہ سے قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چونکہ خود مفتی صاحب کے خاندان میں بھی طب یونانی کے درس اور مطب کی روایت قدیم تھی، کئی نسلوں سے یہ سلسلہ مسلسل چلا آرہا تھا اس لئے طبعی طور پر مفتی صاحب کو اس فن سے خاص مناسبت تھی، کامل الفن اساتذہ کی صحبت و تربیت نے اس کو اور نمایاں کردیا تھا۔ بہر حال مفتی صاحب کی کثیر علمی و عملی مصروفیات میں ایک خاص حصہ طبی مشغولیات کا بھی ہمیشہ شامل رہا، طب کی تعلیم، مطب کا معمول، نسخوں کی تجویز و تحقیق تیاری اور نئے نئے نسخوں اور مرکبات کی آزمائش و تیاری کا عمل مفتی صاحب کی زندگی میں ایک غیر مختتم اور دائمی عمل کے طور پر ہمیشہ جاری رہا۔ مفتی صاحب کے حلقۂ درس میں ہر دور میں طب کے شائقین کی جماعتیں تلمذ و استفادہ کے لئے موجود رہتی تھیں، اور بے شمار افراد نے اس فن میں مفتی صاحب سے استفادہ کیا تھا، مولانا عبد الحی حسنی نے مفتی صاحب کا ہندوستان کے ممتاز ترین اطباء میں شمار کرایا ہے، اور مفتی صاحب کے کثرتِ درس و استفادہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

وأخذ عنه خلق لایحصون بحد وعد (۱۲)	ان سے بہت سے لوگوں نے طب پڑھی جن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔

مفتی صاحب کا کتب خانہ اور تصنیفات و مؤلفات: مفتی صاحب کی تالیفات و مصنفات کا زمانہ ان کے عہد درس وافادہ کی طرح کم سے کم ساٹھ سال پر محیط ہے، مگر افسوس کہ جس طرح مفتی صاحب کے تلامذہ کی کوئی جامع فہرست موجود نہیں، اسی طرح تالیفات کا بھی محقق تذکرہ دستیاب نہیں۔ مفتی صاحب کی تحریر و تالیفات کا اس وقت آغاز ہوا تھا، جب مفتی صاحب شاہ صاحب کی خدمت میں تعلیم میں مشغول تھے، جس کی ابتداء غالباً حضرت شاہ صاحب کے درس وافادات قلم بند کرنے سے ہوئی تھی، یہ ذوق آہستہ آہستہ

(۱۲) الثقافة الاسلامیه فی الهند، ص ۳۱۱ (دمشق: ۱۳۷۷ھ) نیز ملاحظہ ہو، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، مولانا ابو العرفان ندوی، ص ۴۱۹ (اعظم گڑھ: ۱۳۸۹ھ)

بڑھتا ہوا، ایسا شاخ در شاخ اور تناور درخت بن گیا جس کی ہر شاخ علم سے معمور نظر آتی ہے۔ مفتی صاحب نے عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں متنوع موضوعات پر تصنیفات کا ایک بڑا وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا تھا لیکن انقلابات زمانہ اور ناقدری سے اس کا بھی وہی حال ہوا جو غفلت اور ایسے ذخیروں کی قدر و قیمت سے ناواقف ماحول میں ہوا کرتا ہے۔

پہلا حادثہ تو یہ پیش آیا کہ مفتی صاحب کی وفات کے بعد یہ ذخیرہ ان کے ورثاء دونوں صاحبزادوں مولانا ابوالحسن، مولانا ابوالقاسم نیز بحصۂ شرعی صاحبزادیوں پر تقسیم ہوا۔ مولانا ابوالقاسم کے حصہ میں جو کتابیں آئیں ان پر کیا گذری ہمیں معلوم نہیں، صاحبزادیوں میں جو علمی سرمایہ تقسیم ہوا تھا اس کا بھی پتہ نہیں رہا، مولانا ابوالحسن صاحب کا کتب خانہ اگرچہ محفوظ رہا اور ترقی کرتے ہوئے ایک بہت بڑا اور نہایت بیش قیمت کتب خانہ بن گیا تھا مگر وہ بھی تقریباً ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۰ء) کے بعد متواتر گردشوں کی زد میں رہا ہے، اس کتب خانہ کی آخری المناکی یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد نامساعد حالات میں یہ سرمایہ بھی بحصص شرعی ۳۶ سہام پر منقسم ہو کر مولانا کے ورثاء میں بٹ گیا تھا جس میں سے کچھ حصہ تو اہل علم وذوق کی محنت و حفاظت اور قدردانی کی وجہ سے محفوظ رہا، تاہم اس کا بھی بڑا حصہ ضائع اور مرور ایام کی نذر ہوا۔ بہت تھوڑا سا حصہ ایسا ہے جو اس وقت تک محفوظ ہے چوں کہ ذیل کی معلومات بیشتر اسی ذخیرہ پر مبنی ہیں، اس لئے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ذیل میں تصانیف کی جو فہرست درج کی جارہی ہے اس میں اگرچہ اُن تمام کتابوں کے نام درج ہیں جن کا راقم سطور کو علم ہے لیکن یہ مفتی صاحب کی تالیفات کی مکمل فہرست نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کل مصنفات ومؤلفات کی آدھی یا زیادہ سے زیادہ دو تہائی مقدار ہے۔ لیکن جس قدر بھی ہے اس سے مفتی صاحب کی جامعیت تبحر علمی اور دائرہ تصنیف وتحریر کی وسعت کا کافی علم ہو جاتا ہے۔

زیر نظر فہرست میں عربی، فارسی اور اردو کی ایک سو تین مصنفات ومؤلفات، شروح وحواشی اور ترجموں کے نام شامل ہیں اور یہ ذخیرہ متعدد علوم وفنون، تفسیر، تجوید، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، رجال، طبقات، سوانح، عقائد وکلام منطق وفلسفہ، نحو، صرف، ادب، بلاغت، طب، تصوف، عملیات، جفر، رمل، ہیئت وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ اسی سے

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر مفتی صاحب کا تمام علمی ورثہ محفوظ ہوتا، تو وہ کس مقام و مرتبہ کا ہوتا اور اس سے علم و فن کے کیسے کیسے دروازے کھلتے اور نئے نئے گوشے نمایاں ہوتے۔ بہرحال اس وقت تک راقم سطور کو جن تصنیفات کا علم ہوا ہے ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

عربی تصنیفات

(۱) تلخیص وحواشی تفسیر مدارك التنزیل: تفسیر مدارک التنزیل (علامہ ابوالبرکات نسفی کی) شہرۂ آفاق تفسیر ہے، جس کی علمی حیثیت اور بلند مرتبہ محتاج تعارف نہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک طویل سفر کے دوران اس تفسیر کا جامع خلاصہ تیار فرمایا تھا بعد میں اس تلخیص میں نفیس حواشی اضافہ کئے، مفتی صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام مکمل ہوگیا تھا۔

(۲) رسالہ تجوید القرآن: تجوید کے موضوع پر ایک جامع اور مختصر رسالہ ہے۔

(۳) حاشیہ مقدمہ جزریہ للجزری: مجموعہ ہائے تجوید میں مقدمہ جزری کا بعض حیثیتوں کی وجہ سے جو مسلمہ مقام ہے وہ آشکارا ہے۔ مفتی صاحب نے اس پر حواشی تحریر فرمائے ہیں۔ اوسط درجہ کا رسالہ ہے۔

(۴) فتوح الاوراد، شرح حصن حصین: حصن حصین کی دنیائے اسلام میں جو قدر و منزلت ہے اس کی وجہ سے ہر دور میں علماء نے اس کی کئی طرح سے خدمت فرمائی ہے، مفتی صاحب نے بھی اس کی مفصل شرح لکھی تھی، مفتی صاحب نے اپنی ایک یادداشت میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے، اس کا کوئی نسخہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

(۵) وظائف النبوی، خلاصہ حصن حصین: مفتی صاحب کی یادداشت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے حصن حصین کا وظائف النبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نام سے خلاصہ مرتب فرمایا تھا، اس کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔

(۶) حد البصائر فی عد الکبائر: کبیرہ گناہوں کی تفصیلات پر متعدد علمائے امت کی متعدد اہم تصنیفات ہیں، اسی سلسلہ کی ایک اہم اور بہترین تصنیف زیر نظر کتاب ہے۔ اس

میں مفتی صاحب نے کبائر کی تفصیلات، ایک ایک گناہ کبیرہ کا نام اس کی حیثیت درجہ اور گناہ کا ترتیب وار ذکر کیا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ حدالبصائر کبائر کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔

(۷ تا ۱۱) **اربعینات:** مفتی صاحب نے اپنے بعض شاگردوں کو یاد کرانے کے لئے نیز اتباع سنت کی اشاعت و تعلیم کے لئے متعدد اربعینات مرتب فرمائیں جس میں ایک صحیح بخاری سے ہے، ایک مسلم سے، ایک صحیحین سے اور ایک جامع صغیر سے، اس کے علاوہ اور بھی اربعینات مرتب فرمائی ہیں وہ میری نظر سے نہیں گذریں۔

(۱۲) **رسالہ اصول حدیث:** مفتی صاحب نے اصول حدیث پر دو مختصر رسالے لکھے تھے، ایک عربی میں دوسرا فارسی میں، عربی کا مختصر رسالہ حدیث شریف کے بنیادی ضوابط واصول نہایت جامع مگر مختصر ترجمان ہے۔ یہ رسالہ مولانا نظام الدین کیرانوی کے مرتبہ رسالہ اصول حدیث فارسی کے آخر میں سنہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ راقم نے دونوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو گیا ہے۔

(۱۳) **بدور الهدایہ:** نام سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کی ممتاز اور اہم ترین کتاب ہدایہ کا خلاصہ یا اس کا حاشیہ ہے، اس کا مفتی صاحب کی بیاضوں اور مولانا ابوالحسن کاندھلوی کی تحریروں میں کئی جگہ ذکر ہے لیکن اس کے کسی نسخہ کا مجھے علم نہیں۔

(۱۴) **مسائل الزکوٰۃ:** یہ تالیف راقم کی نظر سے نہیں گذری، اس کا ایک اشارہ مفتی صاحب کی بیاض میں درج ہے۔ "مسائل زکوٰۃ۔ تصنیف فقیر الٰہی بخش" نام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عربی میں ہوگی، اس لئے اس کا نام یہاں درج کیا گیا۔

(۱۵) **المطالب الجلیلہ:** اس کتاب میں آیاتِ قرآن کریم، احادیث شریفہ کلمات فقہا اقوال اہل کلام، عبارات صوفیا اور اشعار موحدین کے مشکل ترین عنوانات اور دقیق عبارات و کلمات کو حل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب متعدد مختصر ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک باب میں ایک ایک عنوان کے مشکلات و مغلقات کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ اس کو مفتی صاحب کی اہم تصنیفات میں شمار کیا جانا چاہئے۔

(۱۶) **شیم الحبیبؐ:** سیرت پاک کے دلاویز موضوع پر ایک نہایت جامع مختصر اور قیمتی کتاب جس کا بلا تامل سیرت پاک کی بہترین مختصر کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا اور گویا اس کی مفصل شرح نشر الطیب کے نام سے تحریر فرمائی جو اردو میں سیرت کی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ راقم نے نسخہ مصنف کی مدد سے اس کو دوبارہ مرتب کیا ہے اور نامور عالم، مولانا سلمان الحسینی ندوی سے اس کا نیا ترجمہ کرایا ہے۔

(۱۷) **تلخیص غایۃ السئول:** شہرۂ آفاق عالم و محدث حافظ ابن الملقن (م ۸۰۴ھ) کی نبی اکرم ﷺ کی خصوصیات پر ایک بلند پایہ کتاب "غایۃ السول فی خصائص الرسول ﷺ" ہے، مفتی صاحب نے اس کا خلاصہ تیار فرمایا ہے۔

(۱۸) **صلوٰۃ المستعان لرؤیہ النبی علیہ السلام:** حضرت مفتی صاحب کو ذاتِ نبویؐ سے جو عشق تھا اور شوقِ حضوری میں جو کیفیت رہتی تھی وہ ضبط کے اہتمام کے باوجود ان کی تحریروں اور کلام سے چھلک رہی ہے۔ اسی جذب محبت کا اثر تھا کہ بار بار خواب میں سرور کائنات ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت سے مشرف ہوئے مگر پھر بھی ہر وقت:

مشرف گرچہ شد بے چارہ جامی   خدایا! ایں کرم بارِ دگر کن

کی کیفیت رہتی تھی، یہ درود شریف اسی تمنا اور شوقِ زیارت کا ترجمان ہے۔ اس کی ایک بے مثال خصوصیت یہ ہے کہ اس درود شریف کو اگر مفتی صاحب کی مقررہ ترتیب کے مطابق پڑھا جائے تو حضرت رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوتی ہے، بارہا مختلف اصحاب نے اس کو پڑھا اور جمال جہاں آراء سے مشرف ہوئے:

یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے!

(۱۹) **تذکار اصحاب البدر:** حضرات اہل بدر رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک نام اور ان کے برکات کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

(۲۰) **احوال رواۃ صحیح البخاری:** اس تالیف کا مفتی صاحب نے اپنی

متعدد یادداشتوں میں تذکرہ کیا ہے، یہ کتاب موجود ہے یا ضائع ہو چکی کچھ پتہ نہیں، مگر نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاصی ضخیم اور بیش بہا تصنیف ہو گی۔

(۲۱) احوال علماء حنفیہ: اس کا ذریعہ معلومات بھی حضرت مفتی صاحب کی یادداشتیں ہیں، یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی اہم تالیف ہو گی، خیال ہے کہ شاید اس میں مفتی صاحب کے ہم عصر اور قریبی دور کے ممتاز علماء کے حالات بھی ہوں گے۔

(۲۲) شرح دلائل الخیرات: اس تالیف کا مفتی صاحب نے اپنی تصنیف کی حیثیت سے کئی جگہ ذکر کیا ہے، مگر اس کا کوئی مجھے نسخہ معلوم نہیں۔

(۲۳) شرح ارجوزۃ الاصمعی: ارجوز اُصمعی، شاہ ولی اللہ کے خانوادہ میں مقبول و پسندیدہ تھا، شاہ عبد العزیز نے اس کی شرح لکھی تھی اسی طرح مفتی صاحب نے بھی اس کی شرح لکھی۔

(۲۴) شرح الشرح ارجوزۃ الاصمعی: مفتی صاحب نے ارجوزہ کی جو شرح لکھی تھی بعض عزیزوں کے اصرار پر اس کی بھی وضاحت فرمائی اور اس کو شرح الشرح سے موسوم کیا۔ اس شرح الشرح میں شرح کے نکات کو مزید واضح کیا ہے اور ارجوزہ کے ہر شعر کا فارسی میں منظور ترجمہ بھی کیا ہے۔

(۲۵) شرح القاف الاربعین: چہل قاف ایک ورد ہے جس کا صدیوں سے شہرہ ہے اور اس کو حضرت علی کرم اللہ وجہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خاندانِ ولی اللہی کے علماء میں اس سے استفادہ کا معمول تھا، حضرت شاہ رفیع الدین نے اس کی شرح لکھی تھی اور ان کے رفیق مفتی الٰہی بخش نے بھی اس پر قلم اٹھایا، یہ شرح کتاب ۱۲۲۷ھ میں تالیف ہوئی تھی، موجود ہے۔

(۲۶) شرح قصیدہ بانت سعاد: قصیدہ بانت سعاد تعارف کا محتاج نہیں ہے، مفتی صاحب نے اس کی عربی میں نہایت عمدہ شرح لکھی ہے جس میں اپنی جامعیت کا کمال دکھایا ہے۔ شرح کے علاوہ اس کا ایک امتیاز اور انفرادیت یہ ہے کہ مفتی صاحب نے بانت سعاد

کے ہر شعر کے مفہوم کو نئے انداز سے اسی ردیف و قافیہ میں نظم کیا ہے اور ہر ایک شعر کا فارسی و اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۳۵۳ھ میں شائع ہو چکا ہے، مگر اس طباعت میں بعض فروگذاشتیں رہ گئی ہیں۔

(۲۷) **حاشیہ مقامات حریری**: حریری کی مشہور عالم کتاب پر مفتی صاحب نے مفصل حاشیہ لکھا تھا، جو اچھی شرح کے قائم مقام ہے۔

(۲۸) **تلخیص حیاۃ الحیوان**: دمیری کی حیاۃ الحیوان کا بہت جامع انتخاب ہے یہ کوٹہ کے زمانہ قیام میں مرتب ہوئی تھی، سنہ تالیف درج نہیں۔

(۲۹) **امثال العرب**: اس کو حیاۃ الحیوان کی تلخیص کا دوسرا حصہ کہنا چاہئے، اس میں امثالِ عرب کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(۳۰) **خلاصہ شرح طیف الخیال**: محمد مومن خان شیرازی کی شرح طیف الخیال کا خلاصہ اس کتاب کے صرف آخری دس صفحات میری نظر سے گذرے ہیں، غالباً یہ خاصی ضخیم کتاب تھی۔

(۳۱) **خطبات (بہ صنعت اہمال)**: یہ جمعہ کے خطبات ہیں جو غیر منقوط الفاظ (صنعت مہملہ) میں لکھے گئے ہیں۔

(۳۲) **شرح سلم العلوم**: جب مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا امام الدین کاندھلوی نے مفتی صاحب سے شرح سلم العلوم پڑھی، اس وقت استاذ نے عزیز شاگرد کے لئے سلم کی مفصل شرح لکھی تھی جس میں شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کے افادات بطور خاص درج کئے گئے ہیں۔

(۳۳) **حاشیہ بر حاشیہ میرزاھد بر ملا جلال**: جلال الدین دوانی کے حاشیہ میر زاہد پر بھی مفتی صاحب نے حاشیہ لکھا کیا ہے، اس میں بھی حضرت شاہ عبد العزیز کے افادات کا خاص ترجمہ شامل ہے۔

(۳۴) **شرح رسالہ شیخ بہاء الدین عاملی**: بہاء الدین عاملی کے علم ہیئت

پر مشہور فنی رسالہ کی شرح ہے۔

(۳۵) تلخیص الصواعق فی رد الروافض: یہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی مگر مفتی صاحب کی تحریرات میں اس کا ذکر ہے، یہ بہ ظاہر شیخ ابن حجر مکیؒ کی "الصواعق المحرقہ" کے شیعیت سے متعلق مباحث کی تلخیص ہے۔

(۳۶) خلاصہ حبیب السیر فی اخبار افراد البشر: حبیب السیر غیاث الدین محمود معروف بہ خواند امیر کی معروف کتاب ہے، مفتی صاحب نے اس کے مضامین کا عربی میں جامع خلاصہ مرتب کیا ہے، جس کا کچھ حصہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

(۳۷) رسائل رمل: مفتی صاحب علم رمل میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس کا خاص ذوق تھا۔ اس سے رمل کی مختلف شکلوں پر الگ الگ رسالے مرتب کئے تھے جس کا مفتی صاحب اور مولانا ابوالحسن کی تحریرات میں کئی جگہ ذکر ہے، مگر یہ رسائل اس وقت موجود نہیں ہیں۔

فارسی تصنیفات تراجم منظومات اور کلام

اگرچہ حضرت مفتی الٰہی بخش نے عربی اور اردو میں بھی چالیس سے زائد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں مگر مفتی صاحب کی تالیفات و تصنیفات کا سب سے بڑا ذخیرہ فارسی میں ہے، جو اس وقت روزمرہ کی اور خصوصاً علمی موضوعات پر تصنیف و تحریر کے لئے مروج زبان تھی۔

فارسی میں مفتی صاحب کی ساٹھ سے زیادہ تالیفات و منظومات کا اس وقت تک علم ہے جس میں ممتاز اور اہم ترین کارنامہ مثنوی مولانا کا تتمہ و تکملہ یعنی "اختتام مثنوی مولانا روم" ہے جس کے ذریعہ سے فارسی ادبیات اور سلوک و معرفت کی دنیا میں حضرت مفتی صاحب کو لازوال شہرت اور بقائے دوام کی خلعت عطا ہوئی۔

حضرت مفتی صاحب کا ایک عظیم الشان کارنامہ

(۳۸) اختتام مثنوی: مثنوی مولانا روم کا تتمہ وتکملہ ہے۔ مولانا روم، مثنوی کے چھٹے دفتر کے آخر میں مولانا جلال الدین رومی اپنے معمول کے مطابق ایک قصہ بیان کر رہے تھے، قصہ ابھی نامکمل تھا اور یہ بھی واضح نہیں ہوا تھا کہ مولانائے روم اس واقعہ میں کس حقیقت کا اظہار فرمانا چاہتے ہیں اور اس کے پس پردہ کیا تعلیمات مضمر ہیں کہ ایک مثل شروع ہوگئی۔

"مثل وصیت کردن آں شخص کہ سہ پسر داشت و میراث خود را بہ کاہل ترین پسر داد و بہ قاضی شہر گفت" (۱۳)

اس شخص کی تمثیل جس نے اپنا تمام ترکہ اپنے سب سے کاہل بیٹے کو دینے کی وصیت کی اور قاضئ شہر کو بھی اس کی ہدایت کر دی تھی۔ ابھی اس قصہ کا پوری طرح آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مثل نمودار ہو گئی، اگر یہ کتاب اپنی ترتیب پر آگے بڑھتی تو حضرت مولانا رومؒ کے معمول کے مطابق پہلے یہ مثل مکمل ہوتی اس کے بعد تینوں بیٹے اپنی اپنی کاہلی کی تفصیل بیان کرتے پھر قاضی اس پر فیصلہ سناتا جس سے پڑھنے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس واقعہ کے پس منظر میں کیا راز چھپا ہوا ہے اور مولانا روم اس کے ذریعہ سے کیا پیام پہنچانا چاہتے ہیں، مگر چھٹے دفتر کے اختتام پر ابھی اصل قصہ شروع ہوا ہے تینوں لڑکوں کی کاہلی کی روداد نامکمل ہے، مگر مولانائے روم نے اصل قصہ کو ہی نہیں بلکہ اچانک اس داستان کو یہ کہہ کر بند کر دیا:

در دلِ من ایں سخن زاں میمنہ است ‌ ‌ ‌ ‌ زانکہ از دل جانب دل روزنہ است
چوں فتاد از روزنِ دل آفتاب ‌ ‌ ‌ ‌ ختم شد واللہ اعلم بالصواب

"میرے دل میں یہ بات اس کی طرف سے آتی ہے، کیونکہ دل کو دل سے ایک راہ ہے، جب دل کے سوراخ کا سورج ڈوب گیا، یہ کہانی ختم ہو گئی، اب اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے"

---

(۱۳) مثنوی مولانا روم۔ دفتر ششم ص.... (کانپور ۱۳۲۰ء)

جب ایک عرصہ اسی طرح گذر گیا تو شیخ بہاء الدین ولد نے عرض کیا کہ اگر اس سلسلہ کو ترک کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو کم سے کم اس ناتمام قصہ کو مکمل فرما دیجئے، مگر یہ استدعا بھی نامنظور ہوئی اور مولانا روم نے ارشاد فرمایا کہ:

گفت نطقم چوں شتر زیں پس نخفت — نیستش با ہیچ کس تا حشر گفت
ہست باقی شرح ایں نظم دروں — بستہ شد دیگر نمی آید بروں
ہم چو شتر ناطقہ ایں جا بہ خفت — او بگوید من وہاں بستم زگفت
وقت رحلت آمد و جستن زجو — کل شئی ہالک الا وجہہ
باقی ایں گفتہ آید بے زباں — در دلِ آں کس کہ دارد نورِ جاں (١٤)

اس کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے:

میری طبیعت کی روانی اور قدرتِ کلام یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی، اب اس موضوع پر کسی سے گفتگو نہیں ہو گی، اگرچہ اس داستان کے باقی حصے میرے سینے میں محفوظ ہیں لیکن ان کے باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔

میری، دنیا سے روانگی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اللہ کی ذات پاک کے علاوہ ہر ایک شے فانی ہے.... ہاں! یہ باقی داستان ایسے شخص کی زبان پر آئے گی (اور مکمل ہو گی) جو زندہ و بیدار دل رکھتا ہو گا۔

اس لئے اسی وقت سے اہل ذوق، تشنہ کامانِ محبت اور مسافرانِ راہ معرفت کو اس کا انتظار شروع ہو گیا تھا کہ دیکھئے وہ کون زندہ دل اور صاحبِ کمال شخص ہے جو میخانۂ پیرِ روم کا صدر و جانشین ہو گا اور کس کو مولانا روم کی ترجمانی اور ان کے وارداتِ قلب آشکارا کرنے کی سعادت نصیب ہو گی، کس کا دل مولانا روم کی طرح اسرار و معرفت کا گنجینہ ہو گا اور کس کا قلم ان کہی کہانیوں کا مخزن ہے۔

کئی سو برس تک بے شمار اصحاب اس کے منتظر رہے اور متعدد اصحاب کو یہ خیال ہوا کہ وہ

(١٤) مثنوی دفتر ششم ص..... (کان پور: ١٣٢٠ھ)

اس پیشین گوئی کے مصداق ہیں لہٰذا اور انھوں نے اپنی زبان دانی اور معرفت کے مباحث سے وسیع واقفیت کو تکمیل مثنوی کے لئے کافی سمجھا اس لئے اس میدان میں قدم بڑھایا اور کئی لوگوں نے دفتر ہفتم یا اختتام مثنوی کے عنوان سے منظومات بطرز مثنوی مولانا روم لکھنے کوششیں کیں، لیکن ان میں سے کسی بھی محنت اور تالیف کو اہل علم و معرفت کی مجلسوں میں نہ پذیرائی حاصل ہوئی، نہ قبولِ عام کی سند ملی، جس کی وجہ سے تکمیل مثنوی کا ہمیشہ انتظار رہا اور نگاہیں برابر اس شخص کی منتظر رہیں جو مولانا روم کی پیشین گوئی پر ہر طرح سے پورا اترتا ہو اور اس کا کلام اور مثنوی مولانا کے اسلوب و معیار اور اس کے رنگ و آہنگ سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہو بلکہ یہ کلام بھی مثنوی مولانا روم کے آہنگ و اسلوب اس کی معنویت اس کے تہ در تہ اسرار اور روانی و غنائیت میں اس طرح رچا بسا ہوا ہو کہ وہ مثنوی کا پیوند معلوم نہ ہو بلکہ اس کا ایسا حصہ معلوم ہو جس کے بغیر مثنوی ناتمام معلوم ہو، یہ سعادت من جانب اللہ مفتی الٰہی بخش کے لئے مقدر تھی، مفتی صاحب نے اس سلسلہ کی تکمیل کی اور مثنوی کے ناتمام قصہ کو انجام تک پہنچایا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ (مولانا جلال الدین رومیؒ کی وفات ۶۷۲ھ سے پانچ سو چوالیس سال بعد) ۱۲۱۶ھ میں مفتی صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبد العزیز سے رجوع کیا، شاہ صاحب کی ہدایت پر عمل کیا تو خود مولانا روم کو دیکھا۔ فرمایا: ''وہ تم ہی ہو جو اس کو مکمل کرو گے'' مفتی صاحب نے اس بڑے کام کی تکمیل کے لئے اپنے ہیچ و ناکارہ ہونے کا عذر کیا مگر ہدایت ہوئی تم قلم کاغذ لیکر بیٹھو (پھر دیکھو کیا ہوتا ہے) مفتی صاحب قلم کاغذ لیکر بیٹھے تو گویا قلم خود بخود رواں ہو گیا مفتی صاحب خود فرماتے ہیں:

جذب ذوق و شوق مولانا حسام — می کشد مارا بسوئے اختتام
اختتام مثنویٔ معنوی — می کشد جاں را براہ مستوی
می تراود خود بخود از لب سخن — آنچہ خواہی اے ضیاء الدین بکن
چوں زمامِ عقل من در دستِ تست — ہر کجا خواہی بکش جانِ مست تست
پرتو خور چوں در آبے اوفتاد — آب دادِ آفتابے را بے داد
روح مولانا جلال الدین روم — مہر برج معرفت بحر علوم

پرتوے زو چونکہ بر طور ولم	گشت نورانی تنِ آب وگلم
برزمانم آں مہ چرخ بریں	می زند چشمک ببام دل کہ ہیں
اختتامِ مثنوی آغاز کن	نامۂ سربستہ ام را باز کن
آں حکایت گو کہ ناگفتہ بہ ماں	نظم کن آں دُر کہ ناسفتہ بہ ماند
زود در سلکِ بیاں درکش ورا	در رسد فیضانِ روحانی زما
چونکہ حد خود ندیدم تن زدم	بردرش از عذر سر را من زدم
کاشکن امر از گہر دشوار تر	لاجرم بستم بامرِ او کمر

مفتی صاحب نے داستان کا آغاز اسی گفتگو سے کیا ہے جہاں سے مولانا روم نے ختم فرمادیا تھا، مولانا روم کیا کہنا چاہتے تھے مفتی صاحب نے اس کی حرف بہ حرف ترجمانی اور تکمیل فرمائی ہے، اس طرح کہ مولانا روم کا حرف اختتام مفتی صاحب کی تالیف کا سر آغاز بن گیا ہے، لکھتے ہیں:

"آغاز داستان بیان کردن آں ہر سہ پسر کاہلی خود را و طلب حکم آں قاضی بصدق و صفا۔"

اس قصہ کی ابتدا جب ان تینوں بیٹوں نے اپنی کاہلی کی تفصیل ذکر کی ہے اور قاضی سے دیانت و سچائی کے ساتھ فیصلہ کے طالب ہوئے ہیں:

گفت قاضی کاہلی خود شما	سربسر گوئید تفصیلاً بہ ما
ہر یکے باید کہ گوید حال خویش	تابدانم کاہلی کیست بیش

قاضی نے کہا کہ آپ لوگ اپنی کاہلی کا حال تفصیل سے مجھ سے بیان فرمائیں ہر ایک کو چاہئے کہ اپنی کاہلی کا مفصل حال کہے، تاکہ میں اندازہ کرسکوں کہ کس کی کاہلی بڑھی ہوئی ہے۔

اس داستان سرائی میں مفتی صاحب کا بھی وہی وارفتگی کا انداز ہے۔ ایک بیٹے کی کاہلی کی روداد سنائی جارہی ہے کہ ایک اور تمثیل درمیان میں آگئی، یہ تمثیل اختتام کو پہنچی تھی کہ دنیا کے آخرت کی کھیتی ہونے کا تذکرہ آگیا، اس طرح بات سے بات نکلتی گئی اور کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مفتی صاحب کو مولانا روم سے اُویسی عرفان حاصل تھا اور ان کا دل چشمۂ معرفت یعنی مولانا روم کے بحر بیکراں سے جاملا تھا، جس کا اشارہ مفتی صاحب نے خود فرمایا ہے:

ربط دادی سینہ با سینۂ ربط ایں آئینہ با آئینۂ

جس کی وجہ سے دونوں کے آہنگ اور طریقۂ تحریر و ارشادؒ ،اس قدر یکسانیت اور مناسبت ہے کہ کچھ فرق معلوم ہوتا۔ اختتامِ مثنوی ۱۲۱۶ھ (۲۔۱۸۰۱ء) میں مرتب و مکمل ہوا۔ لفظ ''غیور'' کے ابجدی اعداد سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ تصنیف کی تکمیل کے وقت سے اس کی نقلیں عام ہوگئی تھیں، مفتی صاحب کی زندگی میں نقل کئے گئے متعدد نسخے ہند پاکستان کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

اختتام مثنوی سب سے پہلے مطبع مجمع البحرین (میرٹھ) سے محمد حسین کے زیر اہتمام ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں شائع ہوا(۱۵) اس کے فوراً بعد دوسرا ایڈیشن چھپا، اختتام مثنوی کو چھپتے ہی جو مقبولیت اور اہل علم و معرفت کی مجلسوں میں قبولیت و احترام حاصل ہوا اس کی وجہ سے منشی نول کشور نے بھی اس کی طباعت پر خاص توجہ کی، مطبع نول کشور نے اختتام مثنوی سب سے پہلے مثنوی مولانا کے مکمل نسخہ کے ساتھ چھاپی جو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھپا تھا اور اس کے بعد آج تک ہندوستان بھر میں مثنوی کے جو بھی نسخے چھپے سب میں یہ اختتام یا تکملہ شامل ہے۔ اختتام مثنوی اس کے بعد سے آج تک برابر چھپ رہا ہے اور جب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ہدایت و رہنمائی میں مولانا احمد حسن کان پوری نے مثنوی مولانا روم کے اس اہم تاریخی نسخہ کی اشاعت کا انتظام فرمایا تھا جس پر اور افادات کے علاوہ حضرت حاجی صاحب کے حواشی بھی تھے اور جو مثنوی شریف کا برصغیر میں شائع مثنوی کا سب سے عمدہ، صحیح ترین اور حسنِ طباعت کے لحاظ سے بے نظیر نہایت خوبصورت اور جاذب نظر نسخہ ہے تو حضرت حاجی امداد اللہؒ نے مکہ مکرمہ سے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے نام گرامی نامہ میں تحریر فرمایا تھا:

(۱۵) فہرست کتاب ہائے فارسی چاپ و سنگی و کمیاب، کتب خانہ گنج بخش، راول پنڈی مرتبہ سید عارف نوشاہی ص ۶۸۵۔ (اسلام آباد: ۱۹۸۶ء)

"ونیز اختتامِ مثنوی شریف تصنیف مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب مرحوم کاندھلوی، از نزد مولوی نورالحسن صاحب طلبیدہ، ضرور شریک کردہ طبع نمایند تاکہ کتاب کامل شود" (۱۶)

ترجمہ: اختتامِ مثنوی شریف بھی تصنیف مولوی الٰہی بخش صاحب مرحوم کاندھلوی، مولوی نورالحسن صاحب سے طلب کر کے ضرور شریک کر کے شائع کریں تاکہ کتاب مکمل ہو جائے۔

مولانا احمد حسن نے خانوادۂ مفتی الٰہی بخش سے اختتام کا نسخہ حاصل کیا اور مثنوی کے چھ دفتروں کی طرح اختتامِ مثنوی کو نہایت عمدہ و اعلیٰ معیار پر اعلیٰ ترین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ اگرچہ اختتامِ مثنوی کثرت سے اور بار بار چھپی ہے مگر مولانا احمد حسن کی مرتبہ اشاعت وہ منفرد طباعت ہے جو مثنوی کے دفتروں سے الگ کر کے علیحدہ شائع ہوئی ہے۔

مفتی صاحب سے اختتامِ مثنوی کی اجازت و روایت کا معروف ترین سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہ کے واسطے سے ہے، حاجی صاحب نے مثنوی شریف مولانا ابوالحسن کاندھلوی اور مفتی صاحب کے نواسہ مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی اور یہ دونوں براہ راست حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد تھے۔ (۱۷)

اختتامِ مثنوی کے اردو، سندھی وغیرہ مختلف زبانوں میں نظم و نثر میں متعدد ہوئے ہیں اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کلید مثنوی میں اختتامِ مثنوی کی بھی شرح لکھی ہے۔

(۳۹) ۲۔ رسالہ فضل القرآن: قرآن پاک کے فضائل، اس کی ضرورت و اہمیت، قرآن پاک پڑھنے کا طریقہ اور تلاوتِ قرآن کریم کے مسائل پر مختصر مگر جامع گفتگو کی گئی ہے۔

راقم نے فضل القرآن کا فضیلت قرآن کے نام سے اردو ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔

(۴۰) ۳۔ ترجمہ شاطبیہ منظوم: قرأت کے فن پر شاطبیہ جس مرتبہ کی کتاب ہے اور اس

(۱۶) مرقومات امدادیہ، ص ۵۱۔۵۰ ۳ (خورد سائز، تھانہ بھون، بلا سنہ) نیز مطبوعہ مکتبہ برہان، دہلی ۱۳۹۹۔ مطابق طبع اول، ص ۴۱

(۱۷) ملاحظہ ہو شمائم امدادیہ (احوال و ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) مرتبہ مولوی محمد احسن رضی مگرامی، ترجمہ محمد مرتضیٰ خاں قنوجی ص ۱۲۔۱۳ (لکھنؤ: ۱۳۱۴ھ) نیز امداد المشتاق ص ۷ مرتبہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ص ۷ (دہلی: ۱۹۸۱ء)

فن کی تعلیم وتفہیم میں اس کا جو درجہ اور مقام تھا وہ آج بھی اسی طرح باقی ہے، مفتی صاحب نے طلباء کی سہولت کے لئے شاطبیہ کے مطالب کو فارسی میں نظم کر دیا ہے۔

(۴۱) ۴۔ **جوامع الکلم:** عربی تصنیفات کے تحت اربعینات کا تذکرہ گذر گیا ہے مگر یہ تمام اربعینات عربی میں تھیں، مفتی صاحب نے ان اربعینات کو ایک مجموعہ کی صورت میں مرتب فرمایا ہے، اس پر پانچ صفحہ کی تمہید لکھی ہے، نیز احادیث کے مشکل الفاظ کا فارسی ترجمہ اور کہیں کہیں ضروری شرح بھی حاشیہ پر لکھی ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ چہل احادیث جمع کی گئی ہیں۔

(۴۲) ۵۔ **ترجمہ فارسی منظوم مجموعہ اربعینات:** مفتی صاحب کو چہل احادیث کے چھوٹے چھوٹے مجموعے مرتب کرنے کا بہت ذوق تھا، متعدد رسائل اور ایک مجموعہ کا تعارف گذر چکا ہے، یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں چہل احادیث جمع کی گئی ہیں اور ان میں فارسی کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ جوامع الکلم سے علیحدہ ہے۔

(۴۳) ۶۔ **اصول حدیث منظوم:** اصولِ حدیث کے ضروری بنیادی قواعد مرتب طور پر یکجا اور نظم کئے گئے ہیں، یہ کتاب حدیث کے طلباء کو عربی کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ پڑھانے کے لئے لکھی گئی تھی مؤلف کی یہ توقع پوری ہوئی۔ رسالہ اصول حدیث سب سے پہلے مولانا نظام الدین کیرانوی نے ذی قعدہ ۱۳۲۱ھ میں اپنے مقدمہ اور حاشیوں کے ساتھ شائع کیا تھا جو اس کے بعد بھی بار بار چھپا اس وقت ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ میں راقم سطور نے رسالہ اصول حدیث مولانا نظام الدین کیرانوی کے افادات اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ اصول حدیث اشاعت کے وقت سے مدارس اسلامیہ کے نصاب میں شامل رہا ہے، اس پر مولانا خیر محمد جالندھری نے توضیحی حاشیہ بھی لکھا تھا، یہ حاشیہ بھی کثرت سے طبع ہوا۔

(۴۴) ۷۔ **رسائل البرکات:** یہ نام مفتی صاحب کے قلم سے، ان کی مؤلفات کی فہرست اور ان کی مملوکہ کتابوں کی یادداشتوں میں اسی طرح لکھا ہوا ہے، اس کے متعلق کوئی اور اطلاع نہیں ملی۔

(۴۵) ۸۔ **رسالہ عقائد منظوم:** اہل سنت کے مسلمہ عقائد کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔

(۴۶) ۹۔ **بدء الامالی:** بدءالامالی حضرت امام ابو حنیفہؒ سے منسوب مشہور منظومہ ہے، جس میں صحیح اسلامی عقائد کی ترجمانی و توضیح کی گئی ہے اس پر بہت سے علماء نے حاشیے اور شرحیں لکھیں ہیں، مفتی صاحب نے بھی اس کے مندرجات کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

(۴۷) ۱۰۔ **رسالہ توحید واجتناب کبائر:** توحید کی اہمیت اور کبیرہ گناہوں سے ہمیشہ بچنے کی ضرورت اور اس کی تفصیلات کو منظوم کیا ہے۔

(۴۸) ۱۱۔ **رسالہ فرائض اسلام:** مسلمان کس کو کہتے ہیں اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور قرآن وسنت کی رُو سے کن کن باتوں کا جاننا فرض ہے، کن کا جاننا سنت ہے اور کیا کیا واجبات ہیں سب کا جامع مگر مختصر اور دلآویز منظوم تذکرہ ہے۔

(۴۹) ۱۲۔ **رسالہ ارکان نماز:** نماز ایمان کے بعد سب سے اہم فریضہ ہے، اس کی تفصیلات اس کے فرائض واجبات سنتوں اور مستحبات، نیز نماز کو توڑ دینے والے مکروہ اور ناپسندیدہ اعمال کی تفصیل ہے، یہ بھی منظوم ہے۔

(۵۰) ۱۳۔ **رسالہ کبائر:** ان باتوں کا مفصل منظوم تذکرہ جو کبیرہ گناہوں میں شمار ہیں اور ان کے ارتکاب کے بعد توبہ کے بغیر معافی نہ ہوگی۔

(۵۱) ۱۴۔ **ازالۃ الکفر:** اس کو مذکورہ سلسلہ کی آخری کڑی کہنا چاہئے، جس میں ان سب کلمات اور اعمال کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے جان بوجھ کر بلکہ بھول کر بھی سرزد ہونے پر مسلمان دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے۔

(۵۲) ۱۵۔ **نافع للمفتیین والفقھاء:** یہ نام راقم سطور نے مضمون کی مناسبت سے تجویز کیا ہے، اس پر صرف مجموعہ فقہ لکھا ہوا ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے علماء اور اہل فتویٰ کی سہولت کے لئے ضروری فقہی مسائل کے ماخذ، ضروری جزئیات اور فقہی کتابوں کے عمدہ منتخبات یکجا اور مرتب کئے ہیں۔ افسوس اس اہم تالیف کے اس وقت صرف چند ابتدائی اوراق دستیاب ہیں۔ مکمل نسخہ کا سراغ نہیں ملا۔

(۵۳) ۱۶۔ **تحقیق جواز تمباکو خوردنی:** تمباکو کا استعمال صحیح ہے یا غلط، اگر درست ہے تو

کس حد تک، اس مختصر رسالہ میں اسی مفہوم پر گفتگو کی گئی ہے۔

(۵۴) ۱۷۔ **تحقیق تحریر مولوی فیض علی خراسانی:** اس میں فیض علی خراسانی کے بعض اعتراضات کے جواب میں فقہ حنفی کے بعض مسائل کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ اور ان پر کیے گئے اعتراضات کو دور کیا گیا ہے، اس کا صرف ایک نسخہ معلوم ہے جو انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہے۔

(۵۵) ۱۸۔ **رسالہ جہادیہ منظوم:** مسلمانوں پر کب کن حالات میں جہاد فرض ہو جاتا ہے، جہاد کے کیا فرائض، مسائل اور مطالبات ہیں، اس میں مسلمانوں کو کس جذبہ اور حوصلہ کے ساتھ شریک ہونا چاہیے، یہ تحریک جہاد سید احمد شہید کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

(۵۶) ۱۹۔ **محافل نبوی:** سیرت پاک کے حسین و دلاویز موضوع پر نہایت دلکش پیرایہ میں مرتب تالیف، جس میں ہر باب محفل سے تعبیر کیا گیا ہے، مجھے اس یادگار کتاب کے صرف ایک نسخہ کا علم ہے، جو پاکستان کی ایک پبلک لائبریری میں ہے۔

(۵۷) ۲۰۔ **بدور بدریہ:** محافل نبوی کے بہترین ترجمان و نمائندے حضرات شرکائے جنگ بدر ہیں (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) مفتی صاحب نے جملہ شرکائے بدر کے مستند و معتبر حالات حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے ہیں، شروع میں یہ تذکرہ ہے کہ جملہ شرکاے بدر کی کیا تعداد تھی، اس کے بعد جنگ بدر کی تفصیل درج ہے، بعد ازاں شرکاے بدر کے اسمائے گرامی قلم بند کئے گئے ہیں۔ دو سو صفحہ کی کتاب ہے۔

(۵۸) ۲۱۔ **خلاصہ تواریخِ عجم:** اس کا مفتی صاحب کی بیاضوں، اور یادداشتوں میں جگہ جگہ تذکرہ ہے "تواریخ عجم، تالیف فقیر الٰہی بخش" وغیرہ الفاظ سے، خیال یہ ہے کہ یہ خاصی مفصل کتاب ہوگی مگر مجھے اس کے کسی نسخہ کی موجودگی کا علم نہیں۔

(۵۹) ۲۲۔ **ملہمات احمدیہ:** اس کا ضمناً تذکرہ گزر گیا ہے، یہ کتاب حقیقت میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے ارشاد و تعلیمات سلوک کی جامع اور ترجمان ہے، اس میں وہ باتیں قلم بند کی گئی ہیں جو مفتی صاحب نے حضرت سید صاحب نے سنی تھیں، دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے نسخہ

مؤلف کا اکثر حصہ بھی محفوظ ہے۔

(۶۰) ۲۳۔ ملفوظات حافظ محمود شاہ: مفتی صاحب کے عہد میں حافظ محمود شاہ نامی کوئی بزرگ گزرے ہیں (غالباً، جھنجھانوی) مفتی صاحب کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، زیر تعارف رسالہ میں حافظ محمود شاہ کے ملفوظات قلم بند کئے ہیں، مختصر سا مجموعہ ہے مگر معنویت سے پُر ہے۔

(۶۱) ۲۴۔ رسالہ حضراتِ خمس: حضرات خمس اہل تصوف کی ایک خاص اصطلاح ہے فنی طور پر اس کی تحقیق و تشریح آسان نہیں ہے، مفتی صاحب نے حسب معمول جامعیت کے ساتھ اس کے مباحث کو حل فرمایا ہے، یہ رسالہ اختتام مثنوی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

(۶۲) ۲۵۔ تحقیق مشرب مجدد الف ثانی بسلسلۂ وحدۃ الوجود والشہود: حضرت مجدد الف ثانی نے وحدۃ الوجود کی تردید فرما کر وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش فرمایا تھا، متعدد علماء نے اس کے مختلف پہلوؤں سے اپنی اپنی تصانیف میں روشنی ڈالی ہے، مفتی صاحب نے اس رسالہ میں اس بحث کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے کہ مجدد الف ثانی کا نظریہ بھی محفوظ رہے اور وحدۃ الوجود کا بھی ثبوت ہو جائے۔

(۶۳) ۲۶۔ کتاب تصوف: مفتی صاحب نے اس کا کوئی نام نہیں لکھا مگر یہ مفتی صاحب کی تالیفات میں تصوف کے فنی مباحث پر سب سے عمدہ کتاب ہے، اس کتاب میں تصوف کی تعریف اس کا مقصد اور اس کا طریقہ تعلیم و اصلاح اور اس کی مختلف کیفیتوں، مراحل و منازل اور متعلقہ علمی مباحث، وجود و شہود اور اس کے جملہ مراتب و اصطلاحات پر آسان زبان میں گفتگو فرمائی ہے۔

کتاب کیا ہے، تصوف کے موضوع کا ایک گنجینہ اور بے شمار کتابوں کا عطر و جوہر ہے، مثلاً حقیقت محمدیہ (جو نہایت نازک و لطیف موضوع ہے) کی تفصیلی بحث علامہ محدث حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی تالیف حقیقت محمدیہ سے اخذ کی گئی ہے، اور حضرت شاہ عبد العزیز نیز حضرت شاہ رفیع الدین کی تصنیفات اور ان کے افادات کے ذریعہ اس کے مباحث پر نفیس

اضافات کیے ہیں، یہ کتاب باسٹھ اوراق (۱۲۴ صفحات) پر مشتمل ہے۔

(۶۴) ۲۷۔ **تحقیق حقیقت کعبہ:** حقیقت محمدیہ کی طرح یہ بھی نہایت دقیق اور ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے، مفتی صاحب نے ایک مختصر رسالہ میں اس پر بھی بحث فرمائی ہے۔

(۶۵) ۲۸۔ **یک صد مقام سلوک:** تصوف میں بیعت کے وقت سے درجۂ کمال کی انتہا تک سالک جن مقامات و مراحل سے گذرتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کو قدم بقدم جن مقامات کو طے کرنا ضروری ہے اس کی اجمالی فہرست، جس میں کہیں کہیں مختصر وضاحتیں بھی درج ہیں۔

(۶۶) ۲۹۔ **رسالہ جہادیہ:** (جہاد بانفس و شیطان) اس سے پہلے ایک جہادیہ کا نام آچکا ہے، دونوں کا موضوع الگ الگ ہے، وہ جہاد بالسیف کے موضوع پر تھا، یہ نفس اور شیطان کے ساتھ معرکہ آرائی کے عنوان پر ہے۔ یہ منظوم رسالہ ہے، ۱۳۱۳ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۶۷) ۳۰۔ **ہندی محاورات کی متصوفانہ شرح:** اردو (جس کو مفتی صاحب کے دور میں ہندی ہندوستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کے بعض محاورات کی متصوفانہ شرح، یہ رسالہ مفتی صاحب کی ذہانت اور تصوف پر قدرت و مہارت کا ترجمان ہے۔ مفتی صاحب نے معمولی معمولی محاورات کے ایسے ایسے مطالب بیان کیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

(۶۸) ۳۱۔ **انتخاب مہلکات از کیمیائے سعادت:** امام غزالی کی کیمیائے سعادت اربابِ سلوک و معرفت کے لئے مسلمہ رہنما اور نادر ترین دستاویز ہے، اس کا بابِ مہلکات اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے، مفتی صاحب نے اس کا خلاصہ کیا ہے تاکہ طالبین معرفت ان چیزوں سے محفوظ رہیں جو اُن کو راہ سے بے راہ اور گمراہ کر سکتی ہیں۔

(۶۹) ۳۲۔ **انتخاب ارشاد الطالبین:** حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری کی کتاب ارشاد الطالبین سرمایۂ سلوک کا ایک یادگار حصہ ہے، مفتی صاحب نے اس کا بھی انتخاب فرمایا ہے۔

(۷۰) ۳۳۔ **شرح غزل شمس تبریز:** حضرت شمس تبریز سے منسوب کلام اپنی مقبولیت اور

عرفانی خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ اہل نظر کے یہاں محبوب و مقبول رہا ہے، مفتی صاحب نے ان کی ایک غزل کی عارفانہ وضاحت و تشریح فرمائی ہے۔

(۷۱) ۳۴۔ **شرح غزل اول، دیوان حافظ**: حافظ شیرازی دنیائے تصوف میں عارف شیرازی کے لقب سے مشہور ہیں، ان کے کلام کو معرفت کا خزانہ کہا جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے حافظ کی تین غزلوں پر مختلف اصحاب کی علیحدہ علیحدہ فرمائشوں کی تعمیل میں تین رسالے لکھے ہیں۔ پہلا رسالہ یہی ہے جس کا ذکر ہوا۔

(۷۲) ۳۵۔ **شرح غزل دوم حافظ شیراز**: یہ رسالہ حافظ کی غزل:

سینہ ام از آتشِ دل در غمِ جانانہ بسوخت　　آتشے بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت

کے صرف ایک شعر:

ماجرا کم کن و باز آکہ مرا مردم چشم　　خرقہ از سر بدر آورد بشکرانہ بسوخت

کی شرح میں، جناب امیر اللہ خاں صاحب کے ایک سوال کے جواب میں تحریر ہوا ہے۔

(۷۳) ۳۶۔ **شرح غزل سوم حافظ شیراز**: دیوانِ حافظ کی غزل:

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند　　گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

کی تفہیم و شرح میں لکھا گیا ہے۔

(۷۴) ۳۷۔ **بیاضِ نشاط**: یہ بیاض مفتی صاحب کے فارسی کلام غزلیات و قصائد وغیرہ، اور فارسی کے ممتاز شعراء کے منتخب کلام پر مشتمل ہے، چھوٹے سائز کے ۱۹۳ اوراق پر مشتمل ہے۔

(۷۵) ۳۸۔ **مناجات بحضور اللہ العالمین**: چھیاسٹھ اشعار پر مشتمل یہ مناجات، مفتی صاحب کی کسی تحریر بیاض اور تالیف میں موجود نہیں، مگر اس کی ایک پرانی معتبر نقل موجود ہے۔

(۷۶) ۳۹۔ **ترجمہ ارجوزہ اصمعی**: ارجوزۂ اصمعی کی عربی شرح اور شرح الشرح کا ذکر آچکا ہے، یہ اسی ارجوزہ کا فارسی منظوم ترجمہ ہے، مفتی صاحب نے ارجوزہ کا فارسی نثر میں بھی ترجمہ کیا تھا شرح الشرح ارجوزہ کے تعارف میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

(۷۷) ۴۰۔ **ترجمہ انا المطلوب**: مفتی صاحب کے عہد میں اور اس سے پہلے اوراد

عملیات کے شائقین کی محفلوں میں جو اوراد واشعار وغیرہ خاص طور پر پڑھے اور پسند کیے جاتے تھے اس میں ”انا المطلوب“ بھی شامل ہے، مفتی صاحب نے ”انا المطلوب“ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور کہیں کہیں خاصی وضاحت بھی کی ہے۔

(۷۸) ۴۱۔ **ترجمہ سقانی الحب، کاسات الوصال:** عربی کی ایک مشہور قدیم نظم ہے، منجملہ اور اوراد کے اس کی قرأت اور ورد کا بھی ایک عام ذوق تھا، مفتی صاحب نے اس کا بھی فارسی نظم میں ترجمہ فرمایا ہے۔

(۷۹) ۴۲۔ **کافیہ منظوم:** علامہ ابن حاجب کی مشہور و معروف تالیف کافیہ سیکڑوں برس سے درس میں شامل ہے، اس کی درجنوں شرحیں لکھی گئی ہیں اور حواشی خلاصے وغیرہ تو کہنا چاہیئے بے شمار ہیں، مفتی صاحب نے اس کے جملہ مطالب کو سہل، رواں نظم کی صورت میں منظوم و مرتب کیا ہے۔

(۸۰) ۴۳۔ **صرف اکبر:** مفتی صاحب کے فرزند مولانا ابوالحسن اور بھتیجے مولانا محمد اشرف جب زمانۂ طالب علمی میں ابتدائی درسیات پڑھ رہے تھے صرف میر پڑھ چکے تھے اُس وقت ان کی آسان تعلیم اور قواعد صرف کی زیادہ سے زیادہ واقفیت اور مشق کے لئے یہ کتاب مرتب فرمائی تھی۔ اس میں صرف کے جملہ ابواب، تعلیلات قواعد اجراء مثالوں کے ساتھ اور آسان عبارت میں ذکر کئے گئے ہیں، یہ کتاب ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۸۱) ۴۴۔ **انتخاب رسالہ امام الدین مہندس:** امام الدین مہندس کی تالیفات اپنی علمی قدر و قیمت کی وجہ سے اہل علم کے لئے قابل قدر رہی ہیں، فن بیان پر بھی امام الدین مہندس کا ایک رسالہ ہے، اس رسالہ کا مفتی صاحب نے خلاصہ مرتب کیا ہے۔

(۸۲) ۴۵۔ **مفتی المجربات:** مفتی الٰہی بخش کا زمانۂ طالب علمی سے آخری زمانۂ حیات تک معالجات و مطلب سے گہرا ربط رہا ہے مفتی صاحب کا مطب رجوعات اور مریضوں کی کثرت کی وجہ سے معروف تھا مفتی صاحب نے بلاشبہ لاکھوں علاج کئے اور بیشتر میں کامیابی پائی، اس وسیع مطب اور علاج کی ہمہ وقت طلب کی وجہ سے مفتی صاحب کو ہزار ہا نسخوں کے صحیح و غلط کو

پرکھنے اور آزمانے کا موقع ملا۔ مفتی صاحب کا معمول یہ تھا کہ عام لوگوں کی ضرورت کے نسخے بہت معمولی قیمت اور آسانی سے ملنے والی دواؤں پر مشتمل ہوں، ایسے تمام نسخے جو مفتی صاحب کے تجربہ میں آکر صحیح ثابت ہوئے اور ان کا طب سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی سہولت کے ساتھ استعمال کرلے، اس تالیف میں جمع کئے گئے ہیں۔

(۸۳) ۴۶۔ **مفتی العلاج:** مذکورہ بالا کتاب میں صرف خاص خاص بیماریوں کے نہایت کم قیمت اور بظاہر معمولی لیکن درحقیقت نہایت زود اثر اور قیمتی نسخے درج کئے گئے ہیں، اس کتاب کو مفتی صاحب کا مطب کہنا چاہئے، اس میں ہر قسم کے امراض کی تشخیص ہے اور ان کے چھوٹے بڑے متفرق نسخے درج ہیں، بڑے سائز کی ضخیم کتاب ہے۔

(۸۴) ۴۷۔ **رسالہ نبض:** نبض کی کیا شناخت ہے، کس قسم کی نبض کی کیا رفتار ہوتی ہے، اور مختلف مزاج کے افراد کی نبضوں میں کیا فرق ہوتا ہے اور کس طرح نبض کے اتار چڑھاؤ سے مختلف امراض اور مریض کی اندرونی کیفیات کا صحیح صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ مؤلف کی مہارتِ فن اور طب میں غیر معمولی گہرائی اور نظر کا اس کے ذریعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہ منظوم ہے۔

(۸۵) ۴۸۔ **رسالہ قارورہ:** قارورہ بھی نبض کی طرح امراض کی شناخت میں مددگار ہوتا ہے، قارورہ کی کیفیت، رنگت اور اس کی مختلف تبدیلیوں کے ذریعہ مرض کی نوعیت اور صحت و مرض کی رفتار کا ماہر و تجربہ کار طبیب بیک نظر فیصلہ کرسکتا ہے، مگر اس کے لئے قارورہ کی صحیح معلومات اور متعلقہ پہلوؤں پر فنی نظر ضروری ہے، یہ کتاب اسی موضوع کی رہنما ہے اور ایک اہم ضرورت کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ بھی رسالہ نبض کی طرح منظوم ہے۔

(۸۶) ۴۹۔ **رسالہ تنظیم الادویہ:** جب نبض اور قارورہ کے ذریعہ مرض کی صحیح تشخیص ہوجائے تو اس کے لئے صحیح دواؤں کے انتخاب کا مرحلہ پیش آتا ہے، ہر مریض کو اس کی طبیعت، مرض کی نوعیت اور موسم کے لحاظ سے دوائیں دی جاتی ہیں۔ تنظیم الادویہ دواؤں کا ایک سہل اور بہترین انتخاب ہے، بعض ایسی فنی باتیں اور دواؤں کے اثرات و نتائج کا کچھ ایسا تذکرہ

بھی اس میں مل جاتا ہے، جن کا بڑی کتابوں میں تلاش کرنا آسان نہیں، یہ بھی نظم میں لکھی گئی ہے۔ دراصل یہ تینوں کتابیں مفتی صاحب نے اپنے شاگردوں کو کم وقت میں زیادہ تعلیم اور بہتر رہنمائی کے خیال سے مرتب فرمائی تھیں، یہ تینوں کم سے کم ایک مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔

(۸۷)۵۰۔ **انتخاب علاج الامراض:** علاج الامراض حکیم شریف خاں کی مقبول و معروف کتاب ہے جو عرصہ تک طبیبوں کے لئے مرکز نگاہ رہی ہے، بعض حلقوں میں اس کے سبقاً سبقاً پڑھانے کا بھی معمول تھا۔ مفتی صاحب نے اس کے اہم ترین عنوانات و مباحث کو مختصر کر کے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، جو ضخامت میں اصل کتاب کے چوتھائی سے بھی شاید کم ہے، مگر اصل کتاب کے اہم نسخے، اور ضروری چیزیں اس میں آگئی ہیں۔ مزید یہ ہے کہ خاندان شریفی کے مجربات کے ساتھ تقریباً ہر عنوان کے تحت مفتی صاحب نے اپنے اور اپنے واقفین کے مجربات بھی نقل کئے ہیں۔ یہ مجموعہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۸۸) ۵۱۔ **رسالہ ردّ روافض:** مفتی صاحب کی یادداشتوں اور فہرست مؤلفات میں اس رسالہ کا نام درج ہے، بعض اور اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فارسی میں تھا مگر اس کا کوئی نسخہ راقم سطور کے علم میں نہیں، اس کے صحیح نام کا بھی سراغ نہیں ملا۔

(۸۹)۵۲۔ **خلاصہ تالیف مولانا صبغت اللہ سہالوی:** شیعہ عالم تفضّل حسین خاں نے دیار پورب کے علماء کو مخاطب کر کے حضرات خلفاء ثلثہؓ کی خلافت کا ثبوت طلب کیا تھا، مولانا صبغت اللہ سہالوی نے اس کا فاضلانہ جواب لکھا اور معترض سے چند سوالات بھی کئے جن کے جوابات آسان نہیں تھے، مفتی صاحب نے اس تالیف کا مختصر خلاصہ تیار کیا ہے۔

(۹۰)۵۳۔ **بیاض یمین:** اس بیاض کا مفتی صاحب اپنی بیاضوں میں بار بار ذکر کرتے ہیں اور انداز تحریر سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ مفتی صاحب کو اس سے بڑی محبت ہے، مگر نہایت افسوس ہے کہ ہم اس کی حقیقت سے ناواقف اور اس کے مندرجات سے یکسر بے خبر ہیں، یہ بیاض کہیں موجود ہے یا ضائع ہو گئی، کچھ پتہ نہیں۔

(۹۱) ۵۴۔ **عین البیاض:** اس کا بھی اور بیاضوں میں درج یادداشتوں سے علم ہوتا ہے،

اس کا بھی سراغ نہیں ملا۔ خدا معلوم کہیں ہے یا ضائع ہوگئی ہے۔

(۹۲) ۵۵۔ **بیاض علمیات:** مفتی صاحب انتہائی مصروفیات کے باوجود کثرت سے مطالعہ کرتے تھے اور پابندی سے اس کے ضروری مباحث اور خاص اجزاء قلم بند فرمالیا کرتے تھے اور جو بھی کتاب ان کے مطالعہ میں آتی اس کے کچھ حصے یا اقتباسات اپنی بیاض میں محفوظ فرمالیتے تھے، اس طرح مفتی صاحب کی بیاضیں علوم وفنون کا عطر مجموعہ اور ایک چھوٹے کتب خانہ کی قائم مقام بن گئی ہیں۔

مفتی صاحب کی بیاضیں دو طرح کی ہوتی تھیں مشترک اور مختص، مشترک میں ہر قسم کے اندراجات ملتے ہیں، ہر علم وفن کے، ہر موضوع کے، ذاتی یادداشتیں، مختلف اسفار، غرض یہ بیاضیں ہر پہلو سے مرصع اور رنگارنگ ہیں۔ دوسری قسم کی بیاضیں کسی ایک موضوع کے اقتباسات و معلومات سے پر ہوتی تھیں۔ دونوں قسم کی بیاضوں کی مجموعی تعداد چودہ پندرہ ہوگی، ممکن ہے اس سے بھی زائد ہوں مگر اب تک صرف چھ بیاضیں میری نظر سے گذری ہیں، جس میں ایک بیاض یہ ہے جس کو بیاضِ علمیات سے موسوم کرنا مناسب ہے۔

اس میں بیشتر علمی، فقہی، حدیثی، فنی، اصولی، کلامی اور گوناگوں موضوعات پر صرف علمی چیزوں کے اقتباسات درج ہیں۔ بیشتر حصہ ادب عربی سے متعلق ہے مختلف کتابوں سے اقتباسات، اسفار، کچھ اپنی تصنیفات اور فتاویٰ وغیرہ غرض شروع سے آخر تک صرف علمی بیاض پر مشتمل ہے۔ شاذونادر کوئی اور اندراج جگہ پاسکا ہے۔

(۹۳) ۵۶۔ **بیاض عملیات:** یہ بیاض عملیات، نقوش وتعویذات اور اس کے متعلقات سے لبریز ہے ہر طرح کے عملیات، ہر طرح کے نقوش و تعویذ غرض اس میں عملیات کے ہر پہلو کی معلومات اور سیر کی جاسکتی ہے۔

(۹۴) ۵۷۔ **بیاض متفرقات:** یہ بیاض رنگارنگ معلومات کا گلدستہ ہے اس میں کثرت سے ذاتی یادداشتیں، مستعار آئی ہوئی اور گئی ہوئی کتابوں کے اندراجات، اپنے ذمہ واجب حقوق اور مالی معاملات کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کی تفصیل، اجداد کا تذکرہ، حدیث کی سند،

عملیات، حدیث، فقہ، تفسیر، تصوف، ہر موضوع کے متنوع اقتباسات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس میں فقہی مسائل و اقتباسات کثرت سے نقل ہوئے ہیں لیکن اور چیزیں بھی کچھ کم نہیں۔ اسی میں مفتی صاحب کے اپنے اشعار اور بعض رسائل بھی ہیں۔

افسوس ہے کہ اس قیمتی بیاض کا آخری تقریباً ایک تہائی حصہ موجود و دستیاب نہیں اور موجودہ ایک سو ستاون اوراق میں سے بھی درمیان سے دس بارہ ورق غائب ہیں۔

(۹۵)۵۸۔ **بیاض طب کلاں:** جس شخص نے ایک عمر طب کے مطالعہ و مطب میں گذاری ہو اور دور دراز سفر کر کے ماہرین فن سے ملاقاتیں کی ہوں، اس کی معلومات کس درجہ کی ہوں گی، یہ بیاضیں اس کی گواہی دے رہی ہیں۔ بیشمار طبیبوں کے تجربات، درجنوں کتابوں کے اقتباسات اور ایک ایک مرض کے لئے پچاسوں نسخے سر سے پیر تک کوئی مرض ایسا نہیں جس کے نسخوں اور معالجات کا تذکرہ نہ ہو۔ گویا یہ بیاض اپنے آپ میں ایک خاصے کی چیز ہے، یہ بیاض تقریباً ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۹۶)۵۹۔ **بیاض طب خودر:** اس میں بھی مختلف نسخے اور ایک دو مقامات پر طب کی فنی تحقیق درج کی گئی ہے، مگر اس میں وہ تنوع، جامعیت اور نمائندگی نہیں جو بڑی بیاض میں ہے۔

اردو تالیفات، ترجمے، کلام اور منظومات

مفتی الٰہی بخش کے عہد تصنیف و تالیف میں فارسی، علمی موضوعات اور عمومی تحریر و اظہارِ خیال کی زبان تھی، خصوصاً تحریک سید احمد شہید کے آغاز و عروج کے وقت تک اردو میں علمی نثری تصنیفات کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ یہ تحریک سید احمد شہید کا اثر تھا کہ اردو دیکھتے ہی دیکھتے عام رابطے اور دینی مذہبی رسائل سے بڑھتے بڑھتے دقیق ترین علمی و فنی موضوعات کی زبان بن گئی۔ یہاں تک کہ فارسی کا چلن قصہء ماضی شمار ہونے لگا۔

حضرت مفتی صاحب اس تبدیلی کا مشاہدہ فرمارہے تھے اور شاید جانتے تھے کہ مستقبل میں عوامی رابطے کی زبان فارسی نہیں بلکہ اردو ہوگی، اس لئے مفتی صاحب نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائی اور کئی کتابیں اردو میں مرتب فرمائیں، مگر راقم سطور کو افسوس ہے کہ اس

گو مفتی صاحب کی اردو نثر کا کوئی معتبر نمونہ دستیاب نہیں ہوا، مگر ایک کرم فرما نے لاہور پاکستان سے اطلاع دی ہے کہ حضرت مفتی الٰہی بخش کی اردو نثر میں ایک تالیف "فسانۂ عشق" غالباً سنہ ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع ہو چکی ہے لیکن یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔

تاہم مفتی صاحب کی منظوم تالیفات دستیاب ہیں مفتی صاحب نے اردو نثر میں بھی فقہ اور حدیث کے موضوع پر غالباً متعدد کتابیں لکھی تھیں جو دستیاب نہیں مگر کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے کہ:

"ان کی تصنیف سے بہت سے رسالے اردو میں مشہور ہیں اور ایک مثنوی مولانا روم کا ترجمہ اردو نظم میں اس نے بہت اچھا کیا ہے"(۱۸)

(۵۷) ا۔ مجمع فیض العلوم ترجمہ منظوم دفتر اول مثنوی مولانا روم مفتی صاحب کی اردو کی منظوم تالیفات میں بھی فارسی تالیفات کی طرح اولیت ترجمہ مثنوی مولانا روم کو حاصل ہے، فارسی میں اختتام مثنوی کا تذکرہ تھا یہاں مثنوی کے اردو منظوم ترجمہ کا ذکر ہے۔

مفتی صاحب کی مثنوی مولانائے روم سے جو نسبت اتحاد اور مؤلف مثنوی (مولانا روم) سے جو رابطۂ معنوی قائم تھا اس کا مطالبہ اور حق تھا کہ مفتی صاحب مثنوی کے لعل و گہر کو وقف عام کرنے کی مسلسل کوشش فرماتے رہیں۔ اسی احساس کا ترجمان مثنوی کے پہلے دفتر کا وہ ترجمہ ہے جو مفتی صاحب نے "مجمع فیض العلوم" کے نام سے شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ مثنوی مولانا روم کے اسلوب میں نہایت خوبصورت اور عمدہ ترجمہ ہے، جو اگر مکمل ہو گیا ہوتا تو اردو ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ اور تاریخی یادگار شمار کیا جاتا، مگر مفتی صاحب کی متنوع مصروفیات، اسباق کی کثرت اور اصلاح و تربیت کی ہمہ وقت مشغولیت کی وجہ سے اس کو پورا کرنے کا موقعہ نہیں ملا، بلکہ دفتر اول کا ترجمہ بھی ناتمام رہا، ایک ہزار اشعار کا ترجمہ ہوا تھا جو ہمیشہ فرصت کے انتظار میں محفوظ رکھا رہا کہ جب موقعہ ہو گا اس کو پورا کیا جائے گا، مگر مصروفیات کے ہجوم میں اس کی گنجائش نہیں نکلی، یہ اسی طرح رکھا رہا اور مفتی صاحب انتقال فرما گئے۔ مفتی صاحب کے انتقال کے بعد دوستوں کے اصرار پر مفتی صاحب کے فرزند مولانا ابوالحسن کاندھلوی نے

(۱۸) طبقات الشعرائے ہند، ص ۳۹۳ (لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

دفتر اول کا باقی ترجمہ مکمل کر دیا۔

یہ ترجمہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے، پہلی مرتبہ کلکتہ سے چھپا تھا دوبارہ مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۲۸۴ھ میں شائع ہوا، بعد میں بھی چھپتا رہا۔

(۹۸) ۲۔ **رسالہ منظوم در فرائض و واجبات نماز وغیرہ:** اس نظم میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہو رہا ہے مفتی صاحب نے نماز کے مسائل نظم کئے ہیں۔

(۹۹) ۳۔ **گناہ کبیرہ منظوم:** کبیرہ گناہوں کی تفصیلات پر فارسی میں ایک رسالہ منظوم کیا تھا بعد میں اس موضوع پر اردو میں بھی خاصی مفصل کتاب مرتب فرمائی، مگر یہ فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں، مستقل کتاب ہے۔

(۱۰۰) ۴۔ **رسالہ ازالۃ الکفر، منظوم:** ازالۃ الکفر بھی اسی سلسلہ کی تالیف ہے، اس میں فارسی کے منظومہ ازالۃ الکفر کی طرح ان تمام مسائل، کلمات اور الفاظ کی فہرست دی گئی ہے جن سے ہر مسلمان کو بہر حال احتیاط کرنی فرضِ عین ہے، ان میں سے کسی کے دانستہ یا غلطی سے سرزد ہونے سے کفر کا اندیشہ ہے۔ رسالہ گناہ کبیرہ اور ازالۃ الکفر کا ایک ایک نسخہ ہندو یونیورسٹی بنارس کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

(۱۰۱) ۵۔ **سیف قاطع:** مؤلفہ ۱۲۲۹ھ (   ) شیعوں کی تردید، ان کا خلافِ قرآن وسنت ہونا خود ان کی کتابوں سے ثابت کیا ہے، مصنف کی شیعہ کتابوں پر ایسی وسیع نظر ہے اور اردو نظم ایسی رواں اور پیرایہ اظہار ایسا وسیع ہے کہ کہیں بھی شاعر کو اپنے نظریات و دلائل پیش کرنے میں تکلف و تأمل نہیں ہوتا۔

(۱۰۲) ۶۔ **دیوانِ نشاط:** مفتی صاحب کا فارسی مجموعہ کلام بظاہر ضائع ہو چکا ہے، یہ اردو فارسی کا مجموعہ کلام ہے جس میں مفتی صاحب نے اپنا اردو فارسی کلام جمع کیا ہے۔ چوں کہ اس کا اکثر حصہ اردو میں ہے اس لئے اس کو اردو میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱۰۳) ۷۔ **مثنوی قصہ نوجوانے سہارنپور:** یہ عشقیہ مثنوی ہے، جس میں سہارنپور کے ایک نوجوان شخص کی عشق میں مجنونانہ کیفیت اور اسی غم میں المناک موت کا قصہ قلم بند کیا گیا ہے۔

(۱۰۴) ۸۔ **بکٹ کہانی**: بکٹ کہانی یا بارہ ماسہ اردو کی قدیم شاعری کا ایک اہم حصہ ہے۔ متعدد بارہ ماسے یا بکٹ کہانیاں لکھی گئی ہیں منجملہ ان کے ایک اہم بکٹ کہانی، حضرت مفتی الٰہی بخش کی بھی ہے جو مفتی صاحب نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں تالیف کی تھی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے الفاظ میں:

> ''مفتی الٰہی بخش کی بکٹ کہانی کی لسانی خصوصیات تقریباً وہی ہیں جو افضل (جھنجھانوی) کی بکٹ کہانی کی ہیں، کاندھلہ اور جھنجھانہ ایک ہی لسانی حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں'' (۱۹)

مفتی صاحب کی بکٹ کہانی کا حال مولانا روم کی مثنوی کا سا ہے، حکایات کے پیرایہ میں اپنے سوز دروں کا اظہار وارادتِ قلب کی کہانی اور جذب دل کی ترجمانی مقصود ہے مفتی صاحب کہتے ہیں:

زباں ہر چند ہے سادی زنانی ولیکن درد دل کی ہے کہانی
اگر سمجھے کوئی از راہ تحقیق خدا کے عشق میں ہے گی یہ تدقیق

بکٹ کہانی مفتی صاحب کی مقبول تری تالیفات میں شمار کئے جانے کی مستحق ہے، بکٹ کہانی سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی، پھر سرسید احمد کے بھائی سید محمد نے اپنے پریس سید المطابع دہلی سے چھاپی۔ اس کے بعد مختلف مطابع سے اس کے متعدد ایڈیشن نکلے۔

بکٹ کہانی کا ایک نیا نسخہ نسخۂ مؤلف اور ایک پرانے نسخہ کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے جو مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کے منصوبۂ اشاعت میں شامل ہے۔

(۱۰۵) ۸۔ **مختصر شاہ نامہ**: یہ بھی مفتی صاحب کی تالیفات میں شامل ہے، مگر یہ کس شاہ نامہ کا خلاصہ یا ترجمہ ہے مجھے معلوم نہیں، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

کہوں میں شکر پہلے اس خدا کا کہ جو خالق ہے سب ارض و سما کا

مذکورہ بالا فہرست میں حضرت مفتی صاحب کی ایک سو پانچ تصنیفات، مؤلفات، حواشی،

(۱۹) اردو میں بارہ ماسہ کی روایت، مطالعہ و متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۲۸ (دہلی: ۱۹۸۸ء)

شروحات، تراجم، تلخیصات اور منظومات کا ذکر اور تعارف آیا ہے اور اس میں سے اکثر کتابیں بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں لیکن یہ حضرت مفتی صاحب کی تصانیف و مؤلفات کی مکمل فہرست نہیں ہے خیال ہے کہ ابھی چالیس پچاس کتابیں نیز مؤلفات اور ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

تالیفات و تراجم وغیرہ کے علاوہ مفتی صاحب کی نقل کی ہوئی کتابوں کی بھی خاصی بڑی تعداد ہے، چھوٹی بڑی تقریباً پچاس کتابوں کا مجھے علم ہے، اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنی کتابیں مفتی صاحب کی نقل و تصنیف کی ہوئی ہوں گی، جن کا اب پتہ نہیں۔ وکان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً.

حضرت مفتی صاحب نے حضرت شاہ عبد العزیز کی خدمت میں حاضری کے وقت سے دریائے علم و معرفت کی جو غواصی شروع فرمائی تھی تو زندگی کے آخری دن تک اسی مشغول رہے، اور تقریباً ستر سال تک ایسی بے پناہ اور مصروف زندگی گذاری کہ شاید ایک دن بلکہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا ہوگا انھیں احوال و کیفیات، درس و فادہ اور معمولات کا سلسلہ جاری تھا کہ یک لخت اس سفر کا بلاوا آ گیا جس سے کسی کو بھی نجات نہیں۔

وفات: ۱۴ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ (۱۲ر دسمبر ۱۸۲۹ء) کا دن گذار کر شب میں ایک دوا استعمال کی جس کے کھاتے ہی بے ہوشی طاری ہوگئی ایک شب و روز اسی حال میں گذرے، افاقہ کی کوئی صورت نہیں بنی۔ اسی حال میں اتوار کی شام ۱۵ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ (۱۳ر دسمبر ۱۸۲۹ء) کو مغرب کے وقت جان جان آفریں کے سپرد فرمائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

دوشنبہ ۱۶ر جمادی الاخریٰ مطابق ۱۴ر دسمبر کو خاندانی قبرستان میں جو کاندھلہ کی موجودہ عیدگاہ سے ملحق ہے، اپنے بھائیوں مولانا امام الدین، شاہ کمال الدین اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللّٰہ ورضی عنہ.

حضرت مفتی الٰہی بخش کے چند تلامذہ

مفتی صاحب کے چند تلامذہ کے نام گذر گئے ہیں اگرچہ یہاں مفتی صاحب کے تمام تلامذہ

کا تذکرہ اور ان کے دینی علمی فیضان کا تعارف ممکن نہیں مگر اجمالی طور پر ان کے ناموں کی صرف فہرست درج کی جاتی ہے ان کے دائرہ کار کی وسعت ان کے اور بعد کے علماء اور دینی علمی خدمات پر مفتی صاحب کے اثرات اور برصغیر میں احیائے دین اور علم وکمال کی ترقی میں مفتی صاحب اور ان کے تلامذہ کے حصہ پر بحث کرنے کے لئے مفصل کتاب کا انتظار فرمایئے مفتی صاحب کے تلامذہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت یوسف شاہ روہیلہ
۲۔ مولانا وجیہ الدین، محدث سہارنپوریؒ
۲۔ مولانا مرزا حسن علی (صغیر) محدث لکھنویؒ
۳۔ مولانا حکیم مغیث الدین سہارنپوریؒ
۴۔ مولانا سید محمد قلندر جلال آبادیؒ
۵۔ مولانا عبدالرحیم نانوتویؒ
۶۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ
۷۔ مولانا ابوالحسن کاندھلویؒ
۸۔ مولانا شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ
۹۔ مولانا حافظ احمد علی تھانویؒ
۱۰۔ مولانا محمد حسن رام پوریؒ
۱۱۔ مولانا عبدالرحیم تھانویؒ
۱۲۔ مولانا محمد صادق لوہاریؒ
۱۳۔ مولانا امین الدین فتحپوری کیرانویؒ
۱۴۔ مولوی امین الدین کیرانویؒ
۱۵۔ مولوی محمد مصطفیٰ کاندھلویؒ
۱۶۔ مولوی محمد صابر کاندھلوی
۱۷۔ مولانا حکیم رحیم اللہ کاندھلوی
۱۸۔ مولانا حکیم عزیز اللہ کاندھلوی
۱۹۔ مولانا عبداللہ خاں کاندھلوی
۲۰۔ حکیم عبدالسمیع عرف شیخ بڈھن کاندھلوی
۲۱۔ مولانا نجم الدین بلوچستانی
۲۲۔ حکیم خورشید علی پانی پتی
۲۳۔ مولانا عبدالرحیم خاں جلال آبادی
۲۴۔ مولانا اللہ راضی موضع بابری
۲۵۔ مولانا ابوالقاسم کاندھلوی
۲۶۔ مولانا عبدالرحمٰن کیرانوی
۲۷۔ مولانا حکیم محمد اشرف کاندھلوی
۲۸۔ مولانا۔ مولانا محمد یحییٰ کاکوری
۲۹۔ مولانا عبداللہ رائیں کاندھلوی
۳۰۔ حکیم عبدالسمیع تھانوی
۳۱۔ حکیم محمد مہدی
۳۲
۳۳۔ حکیم شیونا تھ کاندھلوی
۳۴۔ حکیم ہردیال برہم کاندھلوی

نکاح اور اولاد

حضرت مفتی الٰہی بخش کا نکاح مسماۃ صالحہ بنت محمد حاتم (پسر محمد بقاء پسر امیراللہ بن محمد یوسف) فاروقی تھانوی سے ہوا، جو قاضی نصراللہ فاروقی تھانوی کی اولاد میں تھے ان سے چھ اولادیں حیات رہیں دو صاحبزادے مولانا ابوالحسن اور مولانا ابوالقاسم اور چار دختران:

۱۔ وزیرالنسا (زوجہ حکیم محمد اشرف خلف مولانا امام الدین کاندھلوی)

۲۔ امیرالنساء (زوجہ غلام معین الدین پسر کریم الدین تھانوی)

۳۔ فاطمہ (زوجہ غلام حسین بن کریم بخش بن غلام محی الدین جھنجھانوی، غلام حسین مولانا محمد اسماعیل جھنجھانوی کے حقیقی چچا تھے اور حکیم غلام سبحانی جھنجھانوی کے حقیقی بھائی)

۴۔ عائشہ (زوجہ امام بخش خلف شمس الدین بن صدر الدین جھنجھانوی)

مولانا ابوالحسن ولادت تقریباً ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) والد ماجد سے تعلیم حاصل کی پاکیزہ نیک طینت درویش صفت بزرگ تھے باوجود اجازت و خلافت کبھی کسی کو بیعت نہیں کیا متعدد عارفانہ منظوم تالیفات یادگار ہیں جس میں مثنوی بحر الحقیقت، مثنوی گلزار ابراہیم بہت مشہور ہیں اور آج تک چھپ رہی ہیں ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ کے مثنوی مولانا روم کے منظوم ترجمہ کی تکمیل چند اور مثنویاں اور طب میں رسالہ بحران علمی یادگار ہیں مولانا ابوالحسن سے متعدد اہل کمال نے استفادہ کیا جس میں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کا نام نامی سرفہرست ہے۔ ۲۱/ جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ ۲/ مارچ ۱۸۵۳ء بروز چہار شنبہ کاندھلہ میں وفات پائی۔(۲۰)

مولانا ابوالحسن کے صرف ایک فرزند تھے مولانا نورالحسن جو حضرت شاہ محمد اسحاق، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے ممتاز ترین شاگردوں میں ہیں مولانا نورالحسن کا ہندوستان کے مشہور علماء میں شمار ہے مولانا سے بہت سے نامور علماء کو

(۲۰) مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ امداد المشتاق مرتبہ نورالحسن راشد مکتبہ برہان دہلی: 1981ء۔

مولانا نور [illegible]ن صاحب کے چار بیٹے [illegible](۲۱)
مولانا ابوالقاسم ذی علم اور باکمال شخص تھے ان کے پانچ صاحبزادے ہوئے۔ محمد اسحاق محمد یعقوب، محمد عیسیٰ محمد علی اور عبدالحق۔

محمد عیسیٰ لاولد تھے، ان بھائیوں میں سے صرف محمد اسحاق کی اولاد کا سلسلہ چلا۔ محمد یعقوب اور احمد علی کے پسری اولاد نہیں تھی، عبدالحق کے اکلوتے صاحبزادے تھے نصیر الحق (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ممتاز خلفاء میں تھے)، نصیر الحق بھی لاولد تھے اور باقی سلسلہ بھی تقریباً معدوم ہو گیا، صرف مولوی حکیم محمد اسحاق (جو خوش ذوق شاعر اور اچھے عالم تھے) کی پسری اور دختری اولاد کا سلسلہ اس وقت تک جاری اور سرسبز ہے)۔ ان کے اخلاف میں علماء اور اہل کمال پیدا ہوئے۔ آخری دور کے ممتاز عالم، محدث اور مصنف حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی (مؤلف سیرت المصطفیٰ ﷺ اور التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح) کا اسی شاخ سے سلسلہ تھا۔

---

(۲۱) معلومات کے لئے دیکھئے۔ حالات مشائخ کاندھلہ، مجلّہ احوال و آثار کاندھلہ۔ مولانا انعام الحسن نمبر۔

مختصر تذکرہ
بحر العلوم، خاتم مثنوی مولانا روم
حضرت
مفتی الٰہی بخش نشاط
کاندھلوی رح
تالیف
نورالحسن راشد کاندھلوی
ناشر
مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی